انوشا کشمیر میں

محمد یونس حسرت

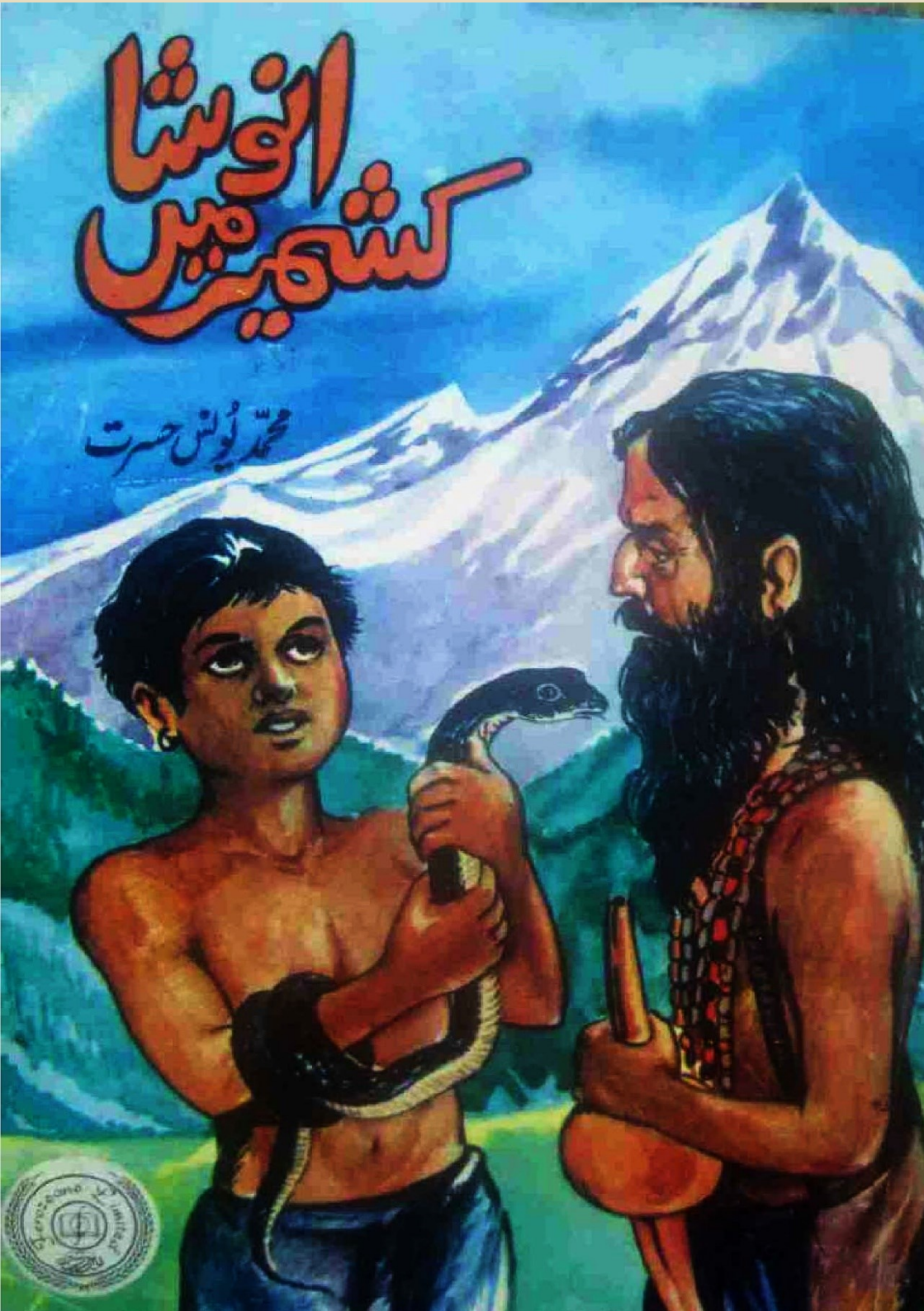

انوشا کی آپ بیتی

پہلا حصّہ

انوشا کشمیر میں

بچوں کے لئے ناول

محمد یونس حسرت

فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ

پہلی بار ۱۹۷۹

تعداد ۴۰۰۰

قیمت ۴۔۰۰

فہرست

انوشا کی آپ بیتی 7

شیش ناگ کا سایہ 16

اندھیر نگری 28

سارنگ بابا 54

تماشا 62

خوفناک مقابلہ 80

چودہ ہاتھ لمبا ناگ 92

یوحانا گ اور گائے 103

سردار کی بیوی 117

برگد کی جڑوں میں 128

پتھر توڑ ناگ 136

غار کے قیدی 152

انوشا کی آپ بیتی

انوشا کی اس حیرت انگیز اور پر اسرار آپ بیتی کا آغاز آج سے ڈھائی ہزار سال پہلے اس وقت ہوتا ہے جب یونان کی ایک چھوٹی سی ریاست مقدونیہ کے بادشاہ فلپ (فیلقوس) کے بیٹے سکندر نے اپنے مُنہ زور سیاہ گھوڑے بیوسی فالس کی باگیں مشرق کی طرف پھیری تھیں اور ایران کی عظیم سلطنت کو روندتا ہوا پنجاب تک آ پہنچا تھا۔ پھر تاریخ کے دھارے کے ساتھ ساتھ بہتے ہوئے یہ داستان تاریخ کے اس نازک اور فیصلہ کن لمحے پر ختم ہوتی ہے جب دریائے جہلم کے کنارے شیش ناگ کے بیٹے چندر گپت موریہ نے سیلوکس کو شکست دی تھی، عین اس جگہ جہاں اس سے پہلے سیلوکس کے آقا سکندر نے راجا پورس پر فتح

پائی تھی۔

سکندر نے آج سے تقریباً دو ہزار سال پہلے (۳۲۷ قبل مسیح) وادیٔ کابل فتح کرنے کے بعد، وادیٔ سندھ کا رُخ کیا تھا۔ اُسے، اس زمانے میں، سپت سندھو یعنی سات دریاؤں کی سرزمین کہا جاتا تھا۔ سات دریاؤں کی یہ سرزمین چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹی ہوئی تھی اور یہ ریاستیں اکثر آپس میں لڑتی رہتی تھیں۔

درّہ مالاکنڈ کے شمال میں اشواک قبیلے کی حکومت تھی جس کا صدر مقام مساگا تھا۔ پشکلاوتی میں (جس کے کھنڈر آج بھی چارسدہ مردان کے قریب موجود ہیں) گندھرو قوم کے کنٹک قبیلے کا راج تھا۔ ہزارہ اور بھمبر کی پہاڑیوں میں راجا امبھی سار حکومت کرتا تھا۔

راجا امبھی سار کی ریاست کے جنوب میں ٹیکسلا کی ریاست تھی جو سندھ سے جہلم تک کے درمیانی علاقے میں پھیلی ہوئی تھی۔ ٹیکسلا کا راجا امبھی تھا۔ جہلم اور چناب کے درمیانی علاقہ پر راجا پورس کی حکومت تھی جو پورو خاندان سے

تعلّق رکھتا تھا۔ ٹیکسلا کا راجا امبھی اس کا بہت بڑا مخالف تھا۔ چناب سے راوی تک کا علاقہ پورس کے ایک رشتے دار کے قبضے میں تھا۔

راوی کے پار کاتھی قبیلے کی حکومت تھی جس کا صدر مقام سانگا تھا جو امر تسر سے کُچھ اوپر گورداسپور کے ضلع میں واقع تھا۔

سندھ، جہلم، چناب اور راوی کے علاقوں میں مختلف قبیلوں کی حکومتیں قائم تھیں جن میں ملّہی، سیلوی، یادو، کشودرک اپنی شجاعت اور حوصلہ مندی کے لیے مشہور تھے۔

انوشا ٹیکسلا کے راجا ابھی کا بیٹا تھا۔ اُس نے ٹیکسلا کے راج محل میں آنکھ کھولنے کے باوجود ٹیکسلا سے دور اپنی ننھیال پشکلاوتی میں شیش ناگ کے سائے میں پرورش پائی تھی، صرف اس لیے کہ نجومیوں کے کہنے کے مطابق راج محل میں رہنا اور راج پاٹ سنبھالنا اس کی قسمت میں نہ تھا۔

انوشا کا بچپن ناگوں کے ساتھ کھیلتے گزرا تھا۔ چناں چہ زندگی کے ہر موڑ پر شہروں

میں بستیوں میں، راج محلوں میں، جنگلوں میں وہ جہاں بھی گیا، اس کا سامنا ناگوں سے ہوتا رہا۔ اس کا ایک قدم انسانوں کی دُنیا میں تھا اور دوسرا ناگوں کی دُنیا میں۔ اکثر یہ دونوں دُنیا میں یوں گڈمڈ ہو جاتی تھیں کہ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ انسانوں کی دُنیا کون سی ہے اور ناگوں کی دُنیا کون سی؟

زندگی کے پہلے دس سال اس نے پشکلاوتی میں گزارے اور پھر اپنی ماں کے مرنے پر وہ کشمیر کے ایک شہر پرور پُور کی طرف چل دیا۔ پرور پُور میں اُس کی بڑی خالہ رہتی تھی جس کا شوہر وہاں تکشک ناگ کے مندر کا پروہت تھا۔ کشمیر کی طرف جاتے ہوئے جب وہ ٹیکسلا سے گزرا تو اسے خبر ملی کہ چند روز پہلے راجا امبھی اور راجا پورس کے درمیان ایک خوف ناک لڑائی ہوئی ہے جس میں پورس نے امبھی کو بُری طرح شکست دی ہے۔ وہ اس خبر پر کان دھرے بغیر آگے بڑھ گیا۔ اُسے گمان تک نہ تھا کہ ایک روز وہ ٹیکسلا آئے گا۔ نہ صرف ٹیکسلا آئے گا بلکہ ٹیکسلا سے مگدہ کے دار السّلطنت پاٹلی پُتر بھی جائے گا۔ (مگدھ کی قدیم سلطنت اس جگہ آباد تھی جہاں بھارت کا صوبہ بہار آباد ہے۔ بہار کے

دارالحکومت پٹنہ کا پرانا نام پاٹلی پتر تھا۔)

انوشا اپنی خالہ کے پاس پرور پُور پہنچا تو قدرت نے اُسے سارنگ بابا کے پاس پہنچا دیا اور سارنگ بابا کی بدولت انوشا کی زندگی میں وہ واقعات پیش آئے جن کا وہ تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ سارنگ بابا اُسے ویری ناگ، کیسر ناگ، بھوگ متی اور کئی دوسری جگہوں پر لے گئے۔ اُس نے سُنہری ناگ کا مَن حاصل کیا، اُس نے بھوگ متی کے جوگی کی لاش سے اُس کی زبان کا تحفہ وصول کیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُس نے کیسر ناگ کو اپنے جسم کا حصّہ بنایا۔ سارنگ بابا کی مہربانی سے اِن تمام مرحلوں سے گزر کہ جب انوشا پرور پُور کی طرف واپس ہوا تو اُس میں حیرت انگیز تبدیلیاں آچکی تھیں۔ آگ، پانی، ہوا اور مٹّی چاروں اُس کا کہا مانتے تھے اور وقت پڑنے پر وہ وقت کی باگیں بھی اپنے ہاتھ میں لے سکتا تھا۔ پھر تقدیر اُسے راجاؤں کی دُنیا میں لے آئی۔ وہ پرور پُور سے سیال کوٹ اور سیال کوٹ سے راجا پورس کے دربار میں گیا۔ سارنگ بابا اور انوشا جب پورس کے دربار سے چلے تو پورس کے دربار کی نام ور رقّاصہ اُوشا اُن کے ساتھ تھی۔ اُس کا پالتو سانپ امبر

انتہائی زہریلا تھا اور اُس کا زہر اُوشا کی سب سے پیاری خوراک تھی۔

وہ پشکلاوتی جانے کے اِرادے سے چلے تھے مگر قسمت اُنہیں ٹیکسلا میں سکندر کے دربار میں لے گئی۔ یہیں اُن کی ملاقات مگدھ کے شہزادے چندر گُپت سے ہوئی جو سکندر سے ملاقات کرنے آیا تھا۔

سکندر کے جانے کے بعد جب سات دریاؤں کی سرزمین میں یونانیوں کے خلاف نفرت اور بغاوت کی لہر اُٹھی تو اُن کی ملاقات دربارہ چندر گُپت سے ہوئی۔ راجا امبھی نے جس طرح پہلے سکندر کی اِطاعت قبول کر کے اُس پر سات دریاؤں کی سرزمین کے دروازے کھول دیے تھے، اِسی طرح اُس نے چندر گُپت کو اِس علاقے میں طاقت پکڑتے دیکھ کر اُس کی اطاعت قبول کر لی تھی اور جب چندر گُپت امبھی کی دعوت پر ٹیکسلا پہنچا تو سارنگ بابا، انوشا اور اُوشا اُس کے ساتھ تھے۔ پھر چندر گُپت اور اُس کے وزیر چانکیہ کے کہنے پر وہ ٹیکسلا سے پاٹلی پُتر کی طرف چلے تاکہ چندر گُپت کو مگدھ کا تخت حاصل کرنے میں مدد دے سکیں جس پر اُس وقت نند خاندان کا راجا سُدھانند حکومت کر رہا تھا۔ یہاں کئی حیرت انگیر

اور خوف ناک واقعات کے بعد جب چندر گُپت کو اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی تو سارنگ بابا، انوشا اور اُوشا نے نیپال کا رُخ کیا۔ سارنگ بابا نیپال میں اپنے بعض پرانے دوستوں سے ملنا چاہتے تھے اور اُس کے بعد شوالک پہاڑ میں شیل شرنگن کی پہاڑی پر اپنے گرو ناگیسن مہاراج کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتے تھے۔

نیپال میں اُنہیں چند ایسے واقعات پیش آئے جو انوشا کے وہم و گمان میں بھی نہ تھے۔ اُنہوں نے ایک ایسی لڑکی کو زندہ کیا جس کی لاش جلا کر اُس کی راکھ ندی میں بہا دی گئی تھی۔ اُنہوں نے کپل وستو کے کیشب کو ایک جوگی سے نجات دِلائی جو ایک عذاب بن کر کیشب پر مسلّط ہو گیا تھا۔ اُنہوں نے رانی روپ وتی کے شوہر کو دو جادُوگر بہنوں کے پھندے سے نکالا اور کانگ مار کی ناگن چندرا کی جان دھولاگری کی راج کماری چندرا کے جسم میں ڈالی۔ پھر جب وہ ناگیسن مہاراج کے پاس پہنچے تو اُنہوں نے سارنگ بابا انوشا اور اُوشا کو جہلم کے کنارے پہنچا دیا جہاں چندر گُپت موریہ اُن کا انتظار کر رہا تھا۔ دریائے جہلم کے ایک کنارے پر چندر گُپت کی فوج ڈیرے ڈالے پڑی تھی اور دوسرے کنارے پر سیلوکس اپنی

فوج کے ساتھ موجود تھا۔ سیلوکس سکندر کی وفات کے بعد بابل سے سندھ تک کے علاقوں کا بادشاہ بن چکا تھا اور اب دریائے سندھ پار کر کے آگے بڑھ رہا تھا کہ چندر گُپت نے جہلم کے کنارے پر پہنچ کر اُس کا راستہ روک لیا، بالکل اُسی طرح جس طرح راجا پورس جہلم کے کنارے سکندر کے مقابلے میں ڈٹ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

اس جنگ میں چندر گُپت موریہ نے سکندر کی طرح چال چلتے ہوئے سیلوکس کو شکست دی۔ سیلوکس نے چندر گُپت کے ساتھ صُلح کر لی اور اپنی بیٹی ہیلن کی شادی چندر گُپت کے ساتھ کر دی، مکران، ہرات، کابل اور قندھار کے علاقے چندر گُپت کے حوالے کیے، اپنا ایک سفیر میگستھیتر چندر گُپت کے دربار میں مقرّر کیا اور چندر گُپت کی طرف سے پانچ سو ہاتھیوں کا تحفہ لے کر واپس چلا گیا۔

تاریخی واقعات کے اس سلسلے میں سارنگ بابا، انوشا اور اُوشا نے جو کردار ادا کیا، اُس کی تفصیل حیرت انگیز بھی ہے اور پُر اسرار بھی۔ ”انوشا کی آپ بیتی“ جس کا پہلا حصّہ آپ کے ہاتھوں میں ہے، ابھی حیرت انگیز اور پُر اسرار واقعات کی دِل

چسپ داستان ہے۔

شیش ناگ کا سایہ

میرا نام انوشا ہے اور میں ٹیکسلا کے راجا امبھی کا بیٹا ہوں۔ یہ شہر میرے پر دادا راجا تکشک کا بسایا ہوا ہے۔ اُس کا اصل نام تکشالا تھا جو بگڑ کر ٹیکسلا ہو گیا۔ دریائے سندھ اور دریائے جہلم کا درمیانی علاقہ میرے باپ کی سلطنت میں شامل تھا۔ میری ماں دریائے سندھ کے پار اُس علاقے کی رہنے والی تھی جہاں گندھرو قوم قبیلوں کی صورت میں آباد تھی۔ میری ماں کنٹک قبیلے کے سردار کی بیٹی تھی اور میرا ماموں اس علاقے کے سب سے بڑے شہر پشکلاوتی کے مندر کا پروہت تھا۔ اس مندر میں ناگوں کے ناگ شیش ناگ کی بہت بڑی، خاص سونے کی بنی ہوئی مورتی تھی۔

میری ماں کی بڑی بہن کی شادی کشمیر کے ایک شخص کے ساتھ ہوئی تھی جو سانپوں کے راجا تکشک ناگ کے مندر کا پروہت تھا۔ یہ مندر پرور پُور سے کُچھ فاصلے پر چکّر کی شکل کے ایک چشمے کے کنارے پر تھا۔ یہاں ہر سال جیٹھ کے مہینے کی پورن ماشی یعنی پورے چاند کی رات کو بڑا بھاری میلا لگا کرتا تھا۔ دور دور سے لوگ آ کر اِس میلے میں شریک ہوتے تھے۔ میری پیدائش پر کئی روز تک خوشیاں منائی گئیں۔ دسویں روز راجا نے، دستور کے مطابق نجومیوں کو حکم دیا کہ وہ میری قسمت کا حال بتائیں۔ نجومی اپنی بھاری بھاری کتابیں کھول کر بیٹھ گئے اور بڑی دیر تک حساب میں لگے رہے۔ اس کے بعد نجومیوں کا سردار اُٹھا اور راجا کے حضور آداب بجالا کر کہنے لگا۔

"مبارک ہو مہاراج! راج کمار قسمت کے بڑے ہی دھنی ہیں۔ بڑے بڑے راجا اِن کے آگے سر جھکائیں گے اور بڑے بڑے سورما اِن کے آگے کان پکڑیں اور ماتھا رگڑیں گے۔ لیکن مہاراج!"

"کیا بات ہے؟" راجا نے بے چین سا ہو کر کہا۔ "کیا تم نے اپنی بات پوری نہیں

کی؟"

"بات یہ ہے مہاراج" نجومیوں کے سردار نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "جہاں تک ہم نے حساب کیا ہے، راج پاٹ اِس راج کمار کی قسمت میں نہیں ہے، راج کمار پر شیش ناگ اور تکشک ناگ دونوں کا سایہ ہے۔ یہ دونوں اُسے یہاں نہیں رہنے دیں گے۔"

"کیا کہا؟" راجا کی آنکھیں حیرانی سے پھیل گئیں۔

"ہمارے راج کمار کو راج محل میں رہنا نصیب نہیں ہو گا، مہاراج۔ وہ راج محل سے دور شیش ناگ اور تکشک ناگ کے سائے میں پرورش پائے گا۔" راجا کا دِل بجھ سا گیا۔ قدرت نے اُسے لڑکا دیا تو تھا، لیکن راج محل میں رہنا اور راج پاٹ سنبھالنا اُس کے نصیب میں نہ تھا۔

اس کے تیسرے روز کنٹک قبیلے کے سردار کی طرف سے ایک قاصد راجا کے دربار میں آیا۔ سردار سخت بیمار تھا اور اُس نے اپنی بیٹی رانی کو بُلایا تھا۔ راجا کو فوراً

نجومیوں کی بات یاد آ گئی۔ اُس کے نزدیک اُن کا کہا پتھّر کی لکیر تھا۔ اُس نے فوراً مجھے اور میری ماں کو قاصد کے ساتھ میرے نانا کے پاس بھجوا دیا۔

کنٹک قبیلے کا سردار بہت سخت بیمار تھا۔ میری ماں کے پہنچنے کے چند روز بعد ہی اُس کی بڑی بہن بھی کشمیر سے آ گئی۔ دونوں بہنوں نے جی جان سے اپنے باپ کی خدمت کی لیکن تقدیر کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔ کوئی ڈیڑھ سال تک بستر سے لگا رہنے کے بعد آخر سردار نے اس دُنیا سے کوچ کیا۔ اُس کے مرنے کے بعد میرے ماموں نے، جو پشکلاوتی میں شیش ناگ کے مندر کا پروہت تھا، قبیلے کی سرداری بھی سنبھال لی۔ میری والدہ کی بڑی بہن کے کوئی اولاد نہ تھی، اِس لیے وہ جب تک قبیلے میں رہی، اپنا سارا لاڈ پیار اور ساری ماما مُجھ پر لُٹاتی رہی۔ جب اُس کا شوہر، جو تکشک ناگ کے مندر کا پروہت تھا، اُسے لینے آیا تو جانے سے پہلے اُس نے مجھے سینے لگا کر بہت پیار کیا۔ پیار کرتے ہوئے اُس کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو میرے گالوں پر گرے تھے۔ اپنی کم سِنی کے باوجود اُن آنسوؤں کی گرمی مُجھے اب بھی یاد ہے۔

اس کے بعد میری ماں کی واپسی کی باری تھی لیکن میں راج محل سے نکل کر شیش ناگ کے سائے میں آ چکا تھا اور دوبارہ راج محل میں جانا میری قسمت میں نہ تھا۔ اِس دوران میں راجا امبھی کی تیسری رانی ایک لڑکے کو جنم دے چکی تھی اور نجومیوں کے حساب کے مطابق راج محل میں رہنا اور راج پاٹ سنبھالنا اِس لڑکے کی قسمت میں لکھا تھا۔ اُس لڑکے کے پیدا ہونے کے چند دِن بعد راجا امبھی کا ایک قاصد ہمارے پاس آیا۔ قبیلے والوں کا خیال تھا کہ وہ راجا کی رانی اور بچّے کو لینے کے لیے آیا ہے لیکن اُن کا خیال غَلَط نکلا۔ راجا امبھی نے میری ماں کو پیغام بھجوایا تھا کہ:

"تم جہاں ہو، وہیں اپنے بیٹے کے ساتھ شیش ناگ کے سائے میں رہو۔ یہاں آنے کی ضرورت نہیں۔ اگر تم واپس آؤ گی تو راج محل کے دروازے اپنے لیے بند پاؤ گی۔"

میری ماں نے تقدیر کے اِس فیصلے کو خاموشی اور حوصلے کے ساتھ قبول کر لیا۔ اُس کی آنکھ سے کوئی آنسو نہ ٹپکا۔ قبیلے کے سردار کی بیٹی کی حیثیت سے سارا قبیلہ

اُس کی عزّت کرتا تھا۔ تہواروں کے موقع پر لوگ شیش ناگ کے مندر میں چڑھاوے چڑھاتے تو ہم ماں بیٹوں کے لیے نذرانے لانا نہ بھولتے، فرق صرف راج محل اور قبیلے کی زندگی کا تھا۔ آرام کے لحاظ سے قبیلے کی زندگی راج محل سے کم نہ تھی۔

یہاں میری زندگی ہر طرح کے فکر سے آزاد تھی۔ میں قبیلے کی بستیوں میں اِس شان سے گھومتا تھا جیسے اِن بستیوں کا سردار ہوں۔ پھر بستیوں سے ہوتے ہوئے میں، جنگلوں میں دور دور تک نکل جاتا تھا۔ اِن جنگلوں میں درندے بھی تھے اور سانپ بچھّو بھی، لیکن میرے دِل میں تو جیسے کسی چیز کا خوف تھا ہی نہیں۔ میں سانپوں کے ساتھ یوں کھیلا جیسے بچّے کھلونوں سے کھیلتے ہیں۔ اِن سانپوں نے مجھے کبھی نہیں کاٹا۔ ممکن ہے کبھی کاٹا بھی ہو، لیکن اِس کا اثر مجھے معلوم نہ ہوا۔ شاید نجومیوں کی یہ بات درست ہی تھی کہ مُجھ پر شیش ناگ کا سایہ ہے۔

شاید سانپ بھی یہ بات جانتے تھے۔ میں جب جنگل میں جا کر سیٹی بجاتا تو کہیں نہ کہیں سے کوئی سانپ نکل کر میرے سامنے آ جاتا اور پھر وہ میرے سامنے یوں

لوٹ پوٹ ہونے لگتا، جیسے کوئی بازی گر اپنے کرتب دکھا رہا ہو۔ سچّی بات تو یہ ہے کہ میں نے جب سے ہوش سنبھالا، سانپوں کو اپنے آس پاس دیکھا۔ دو چار یا دس بیس نہیں، سو سو سانپ ایک وقت میں۔ میرے سامنے کھیلتے رہے میں۔۔۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔ میں بھی اُن کے ساتھ کھیلتا رہا ہوں۔

سانپوں کے ساتھ میری دل چسپی کا عِلم میری ماں ہی کو نہیں پورے قبیلے کو تھا۔ قبیلے والوں نے اِس سے کام لینے کا طریقہ بھی نکال لیا تھا۔ وہ اگرچہ شیش ناگ کی پوجا کرتے تھے، ناگ دیوتا کے نام کے چڑھاوے چڑھاتے تھے، لیکن کہیں سانپ نظر آجائے تو خوف سے بھاگ جاتے تھے۔

سال کے سال پشکلاوتی کے مندر میں ناگ پنچمی کا تہوار بڑی شان سے منایا جاتا تھا۔ یہ سمجھا جاتا تھا کہ اِس تہوار پر جو شخص جتنے زیادہ سانپوں کو دودھ پلائے گا اتنا ہی اُس کا سال اچھا گزرے گا۔ ہوتا یہ تھا کہ لوگ کٹوریوں میں دودھ بھر کر مندر کے اندر اور اس کے آس پاس رکھ دیتے تھے۔ اِدھر اُدھر سے سانپ آتے اور دودھ پی لیتے۔ اب یہ ہونے لگا کہ دودھ کی کٹوریاں بھر کر رکھ دی

جاتیں اور درمیان میں مجھے کھڑا کر دیا جاتا۔ میں سیٹی بجانا شروع کرتا۔ سانپ آتے اور دودھ پی جاتے۔ کٹوریاں صُبح سے شام تک کئی بار دودھ سے بھری جاتیں۔ دودھ کے ختم ہو جانے تک یہ سلسلہ چلتا رہتا۔

دس سال کی عُمر کو پہنچے تک میری زندگی اِسی طور سے گزرتی رہی۔ وقت گزرنے کے ساتھ سانپوں کے ساتھ میری دل چسپی بڑھتی گئی تھی۔ سیٹی کے ساتھ ساتھ اب میں بِین بھی بجانے لگا تھا۔ میری بِین کی آواز سانپوں کو مست کر دیتی تھی۔ ناگ پنچمی کے تہوار پر سانپوں کو جمع کرنے کے لیے اب میں سیٹی کے ساتھ ساتھ بِین سے بھی کام لینے لگا تھا۔

پھر وہ واقعہ پیش آیا جس کے متعلّق میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ جیٹھ کے مہینے کی پورن ماشی (پورے چاند کی رات کو) میری ماں پُراسرار طور پر بیمار ہو گئی۔ شام تک وہ اچھی بھلی تھی۔ جیسے ہی اُس رات کا پورا چاند آسمان پر نمودار ہوا، اُس کی حالت خراب ہونے لگی۔ اس کی بیماری بہت عجیب تھی۔ وہ ذرا دیر کے لیے ہوش میں آتی اور پھر بے ہوش ہو جاتی۔ کُچھ دیر بے ہوش رہنے کے بعد جب اُسے

ہوش آتا تو صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ پہلے کی نسبت کمزور ہو چکی ہے۔ میں اُس کے پلنگ کی پٹّی سے لگا بیٹھا تھا۔ بار بار ایک ہی بات میری زبان پر آ رہی تھی۔

"ماں! یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے، ماں؟"

لیکن مجھے ماں کی طرف سے اپنے سوال کا جواب نہیں مل رہا تھا۔ پھر جب وہ ایک بار خاصی دیر تک بے ہوش رہنے کے بعد دوبارہ ہوش میں آئی تو اُس کے ہونٹوں پر کمزور سی مُسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہ میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے رُک رُک کر کہنے لگی۔

"انوشا بیٹے! میں نے ابھی ابھی اپنی بڑی بہن کو دیکھا ہے۔ آج جیٹھ کی پورن ماشی ہے نا۔ اس وقت وہ دونوں میاں بیوی تکشک ناگ کے میلے میں ہیں۔ میری بہن مُجھ سے کہہ رہی تھی کہ تم اپنا فرض پورا کر چکی ہو۔ اب انوشا میرا ہے۔ اور بیٹے! میں خود بھی یہی محسوس کر رہی ہوں۔ میرا فرض پورا ہو چکا ہے۔ اب مجھے یہاں سے جانا ہے۔ نجومیوں نے غَلَط نہیں کہا تھا۔ تم پر شیش ناگ اور تکشک ناگ،

دونوں کا سایہ ہے۔ زندگی کے پہلے دس سال تم نے شیش ناگ کے سائے میں گزارے ہیں۔ شاید اگلے دس برس تم تکشک ناگ کے سائے میں گزار دو گے۔ میرے بعد تم سیدھے میری بہن کے پاس پہنچ جانا۔ سُن رہے ہو نا؟"

"سُن رہا ہوں، ماں" میں نے رُندھے ہوئے گلے سے کہا۔

"روؤ نہیں، بیٹے۔" میری ماں نے کہا۔ "تمہارے رونے سے میری روح بے چین ہوتی ہے۔ تمہیں تو آگے چل کر بہت کُچھ کرنا ہے۔ بھول گئے، نجومیوں نے کیا کہا تھا تمہارے بارے میں؟ میں اِس دُنیا میں تمہارے پاس نہیں ہوں گی لیکن میری روح اگلے جہان میں اُس گھڑی کا انتظار کرتی رہے گی جب نجومیوں کا کہا پورا ہو گا۔ جب وہ دِن آئے گا کہ بڑے بڑے راجا میرے انوشا کے آگے سر جھکائیں گے۔ جب بڑے بڑے سُورما میرے انوشا کے سامنے کان پکڑیں گے اور ماتھا رگڑیں گے۔۔۔۔۔"

"ماں! ماں!" میں بے چین ہو کر چیخ اُٹھا۔ ماں کی آواز آہستہ آہستہ ڈوبتی جا رہی

تھی۔

ماں نے ایک بار پھر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا:

"دیکھو! جیسا میں نے کہا ہے، ویسے ہی کرنا۔ مجھے اپنی بہن سے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ وہ تمہاری راہ دیکھ رہی ہے۔۔۔۔۔ تمہاری راہ دیکھ رہی ہے۔۔۔۔۔۔ تمہاری راہ۔۔۔۔" اور یہ کہتے کہتے وہ پھر بے ہوش ہو گئی۔ کبھی ہوش میں نہ آنے کے لیے!

میری ماں کی موت نے سارے قبیلے میں غم کی لہر دوڑا دی۔ کسی کے گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ وہ یوں اچانک اِس دُنیا سے رُخصت ہو جائے گی۔ سارا قبیلہ مُجھ سے ہمدردی کا اظہار کر رہا تھا لیکن میں قبیلے کے لوگوں کی طرف یوں کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے وہ مُجھ سے نہیں، کسی اور سے ہمدردی ظاہر کر رہے ہوں۔ میری آنکھ میں کوئی آنسو نہ تھا۔ نہ جانے کیسے ماں کے آخری بار بے ہوش ہوتے ہی میرے آنسو اپنے آپ خشک ہو گئے تھے۔

میں اپنی ماں کی آخری رسوم ادا ہونے تک قبیلے میں ٹھہرا رہا۔ قبیلے والے مُجھے اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے۔ میرے ماموں نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ میں پشکلاوتی کے مندر کے پروہت یا قبیلے کی سرداری میں سے جو عہدہ بھی چاہوں، لے سکتا ہوں۔ لیکن میری زندگی کا فیصلہ تو میری ماں پہلے ہی کر چکی تھی۔ اپنی ماں کی آخری رسوم سے فارغ ہوتے ہی میں نے اپنے ماموں اور قبیلے والوں کو الوداع کہا اور وہاں سے چل دیا۔ کشمیر میں تکشک ناگ کا مندر میری منزل تھی۔ انوشا شیش ناگ کے سائے سے نکل کر تکشک ناگ کے سائے میں جا رہا تھا۔

اندھیر نگری

کشمیر کی طرف جاتے ہوئے جب میں ٹیکسلا سے گزرا تو میرے دِل کی عجیب حالت ہو گئی۔ یہ وہ شہر تھا جہاں میرے باپ کی راجدھانی تھی، جس کے راج محل میں مَیں نے آنکھیں کھولی تھیں۔ میں راجا امبھی کا بڑا بیٹا تھا۔ راج کمار انوشا۔ لیکن یہ پرانی باتیں تھیں۔ میں اُس کے لیے گویا ہمیشہ کے لیے مر چکا تھا۔ شاید اس لیے کہ شاہی تخت پر بیٹھنا قسمت میں نہ تھا اور راجا کی تیسری رانی ایک لڑکے کو جنم دے چکی تھی اور نجومیوں کے حساب کے مطابق راج محل میں رہنا اور راج پاٹ سنبھالنا اُس لڑکے کی قسمت میں لکھا تھا۔

میں نے اپنے آپ پر نظر ڈالی۔ شکل صورت سے میں اچھا خاصا بھکاری لگ رہا تھا۔ قسمت کے کھیل کیسے عجیب ہیں! میں نے سوچا۔ ایک راج کمار اس شہر کی گلیوں میں جوتیاں چٹخاتا پھِر رہا ہے اور دوسرا راج کمار اِسی شہر کے راج محل میں عیش کر رہا ہے۔ لیکن یہ سوچ کر میرے دِل نے کوئی دُکھ محسوس نہیں کیا۔ میری دُنیا ہی دوسری تھی۔ میری منزل ٹیکسلا کا تخت نہیں، کشمیر میں تکشک ناگ کا مندر تھی۔

رات میں نے ٹیکسلا کی ایک سرائے میں بسر کی۔ سرائے میں دوسرے مسافروں کی زبانی معلوم ہوا کہ ابھی کُچھ روز پہلے راجا پورس اور رانا امبھی کے درمیان ایک خوف ناک لڑائی ہوئی ہے۔ راجا امبھی جہلم اور سندھ کے درمیانی علاقے پر حکومت کرتا تھا اور دریائے جہلم اور دریائے چناب کے درمیانی علاقے پر راجا پورس کی حکومت تھی۔ دونوں راجاؤں کے درمیان شروع ہی سے دُشمنی چلی آ رہی تھی اور اُنہیں جب بھی موقع ملتا تھا، وہ ایک دوسرے پر وار کرنے سے نہیں چوکتے تھے۔ لیکن اِس بار راجا پورس نے راجا امبھی کی فوجوں کا پلیتھین نکال کر

رکھ دیا تھا، اُس کے ہزاروں پیادے اور سوار کھیت رہے تھے، آدھے سے زیادہ جنگی رَتھ بے کار ہو گئے تھے اور گھُڑسواروں میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جسے کوئی زخم نہ آیا ہو۔ راجا پورس کو ہی نہیں راجا امبھی کے وزیروں کو بھی یقین تھا کہ راجا امبھی اب کبھی پورس کے مقابلے پر آنے کی جرأت نہ کرے گا۔

اِس خبر نے میرے دِل پر کوئی خاص اثر نہیں کیا۔ میں نے اسے یوں سُنا جیسے یہ شکست میرے باپ کی نہیں، کسی اور راجا کی تھی۔ باپ اور بیٹے کا تعلّق اب باقی بھی کہاں رہا تھا!

اگلی صُبح میں سرائے سے نکلا اور اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔

سفر کی تکلیفیں برداشت کرتا اور مانگ تانگ کر پیٹ بھرتا کئی مہینوں کے بعد میں تکشک ناگ کے مندر پہنچا۔ میری خالہ نے مُجھے دیکھتے ہی اپنی آغوش میں بھینچ لیا اور میرا مُنہ سر چومنے لگی۔ اُسے میری ماں کے مرنے کی بات معلوم تھی، اِس لیے کہ جس طرح میری ماں نے بے ہوشی کی حالت میں اپنی بہن کو دیکھا تھا،

اُسی طرح میری خالہ نے بھی میری ماں کو خواب کی حالت میں دیکھا تھا اور تب سے وہ دِن رات میری راہ تک رہی تھی۔ پھر جب اُس نے میری زبانی سارے حالات سُنے تو اُس کی آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی۔ اس کو روتے دیکھ کر میرا دِل بھر آیا اور وہ انوشا جس کی آنکھوں سے ماں کے مرنے پر ایک بھی آنسو نہ نکلا تھا، خالہ کو روتے دیکھ کر بلک بلک کر رونے لگا۔

خالہ کے گھر پہنچ کر میں نے چند دِن آرام کرنے میں گزارے، پھر ایک روز بِین اُٹھائی اور باہر کی طرف نکل گیا۔

میں نکلا تو جنگل کی طرف جانے کے ارادے سے تھا، لیکن میرے قدم اُس راستے پر اُٹھنے لگے جو پرور پُور کی طرف جاتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی میں اُس شہر میں پہنچ گیا اور اِدھر اُدھر کی سیر کرنے لگا۔

ٹیکسلا اور پشکلاوتی کے مقابلے میں یہ شہر معمولی سا تھا۔ لیکن معمولی ہونے کے باوجود اِس کی عجب شان تھی۔ یہ شہر راجا انبارائی کی راجدھانی تھا۔ یہ راجا بھی

عجیب تھا، اُس کی پرجا بھی عجیب تھی اور اُس کے قانون بھی عجیب تھے۔

میں یوں ہی بے مقصد شہر کے بڑے بازار میں پھِر رہا تھا کہ ایک چوک میں شور سُن کر ٹھٹک گیا۔ دوڑ کر قریب پہنچا تو دیکھا کہ راجا کے سپاہی ایک ہٹّے کٹّے آدمی کو گھسیٹے ہوئے لے جا رہے ہیں۔ میں نے ایک شخص سے ماجرا پوچھا تو اُس نے پہلے تو مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا، پھر کہنے لگا۔

"یہ اندھیر نگری ہے، میاں لڑکے۔ یہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ میرے پلّے کُچھ نہ پڑا تھا، اس لیے اصل بات معلوم کرنے کی غرض سے دوسرے لوگوں کے ساتھ ہو لیا جو شاید اس آدمی کا تماشا دیکھنے راجا کے دربار کی طرف جا رہے تھے۔

کُچھ دیر بعد سپاہی اُس آدمی کو لے کر راجا کے دربار میں پہنچ گئے۔ راجا شکل صورت سے عجیب معلوم ہوتا تھا۔ اس کے چہرے پر راجاؤں والی کوئی بات تھی ہی نہیں۔

دربار میں اُس آدمی کے ساتھ جو کُچھ ہوا، اس سے مُجھے ساری بات معلوم ہوئی۔ یہ معاملہ اِس قدر عجیب و غریب تھا کہ مجھے دیر تک اُس کا یقین نہیں آیا۔

اس شخص کا نام رامو تھا اور وہ ایک جوگی سارنگ بابا کا چیلا تھا۔ کُچھ عرصہ پہلے سارنگ بابا اپنے اِس چیلے کے ساتھ پھِرتے پھراتے پرور پُور میں آ نکلے، اُنہوں نے شہر کے کنارے ایک باغ میں ڈیرا ڈالا اور اپنے چیلے رامو کو شہر بھیجا تا کہ وہ کھانے پینے کا کُچھ سامان خرید لائے۔ رامو شہر میں گیا۔ سامنے ہی اُسے سبزی کی ایک دُکان نظر آئی۔ بھاؤ پوچھا تو ہر ترکاری ٹکے سیر۔ اُس نے کُچھ ترکاری خریدی اور آگے بڑھ گیا۔

ذرا آگے ایک حلوائی کی دُکان تھی۔ وہاں بھاؤ پُوچھا تو ہر مٹھائی ٹکے سیر۔ وہ خوش بھی ہوا اور حیران بھی۔ دُکان دار سے کہنے لگا۔ "یہ کیا بات ہے میاں کہ اِدھر ہر ترکاری ٹکے سیر اور یہاں ہر مٹھائی ٹکے سیر۔"

دُکان دار نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ارے مورکھ! جانتا نہیں کہ تُو کہاں آیا ہے؟

اندھیر نگری، چوپٹ راجا، ٹکے سیر بھاجی، ٹکے سیر کھاجا۔"

رامو نے اور کُچھ نہیں پوچھا۔ خوش ہو کر ڈھیر ساری مٹھائی خریدی اور واپس ہوا۔ ترکاری اور مٹھائی سارنگ بابا کے سامنے جا رکھی اور کہنے لگا۔

"گرو جی مہاراج! یہ تو بڑے مزے کی جگہ ہے۔ ایک ٹکا دو اور سیر بھر ترکاری لے لو اور ایک ٹکا دو سیر بھر مٹھائی لے لو۔ بھاجی اور کھاجا دونوں ٹکے سیر۔ کیا ٹھاٹھ ہیں اِس شہر کے!"

رامو کی بات سُن کر سارنگ بابا حیران رہ گئے۔ بولے "کیا کہا تم نے؟ بھاجی اور کھاجا دونوں ٹکے سیر!"

"ہاں مہاراج۔" رامو نے کہا۔ "میری مانیں تو ہمیشہ کے لیے یہیں ٹِک جائیں۔"
"نہیں بیٹے" سارنگ بابا نے کہا۔ "ایسی جگہ جوگیوں کے لیے اچھا ٹھکانا ثابت نہیں ہو سکتی جہاں ہر چیز ایک ہی بھاؤ بکتی ہو۔ ہمیں فوراً یہاں سے چل دینا چاہیے۔ یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں۔"

”نہیں باباجی۔“ رامو نے کہا۔ ”اِس سے اچھی جگہ ہمیں کہاں ملے گی۔ ایک ٹکا دو اور جو جی چاہے پیٹ بھر کے کھاؤ۔ میں تو یہیں رہوں گا۔“

سارنگ بابا نے رامو کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن رامو پر تو ٹکے سیر بھاجی، ٹکے سیر کھاجا کا جادُو چل گیا تھا۔ اس نے آگے جانے سے انکار کر دیا۔ چناں چہ اُس کو وہیں چھوڑ کر سارنگ بابا آگے چل دیئے۔

سارنگ بابا کے جانے کے بعد رامو دِن بھر شہر کے بازار میں پھِرتا رہتا۔ اُسے جوگی سمجھ کر لوگ دو چار ٹکے ہاتھ پر رکھ دیتے اور یہ دو چار ٹکے اُس کے لیے کافی ہوتے تھے۔ صُبح، دوپہر، شام اُسے حلوا اور مٹھائی کھانے کے سوا اور کوئی کام نہ تھا۔

جب وہ سارنگ بابا کے ساتھ اِس شہر میں آیا تھا تو بہت دُبلا پتلا تھا۔ لیکن اب حلوا کھا کر بھینسے کی طرح موٹا تازہ ہو گیا تھا۔ اُس کے جسم پر چربی کی تہیں چڑھتی جا رہی تھیں۔

رامو دِن رات حلوا کھانے کی دُھن میں لگا ہوا تھا کہ شہر میں ایک عجیب واقعہ ہوا۔ چار چوروں نے رات کے وقت ایک مکان کی پچھلی دیوار میں نقب لگائی۔ یہ دیوار کچّی تھی۔ جب وہ اُس مکان کے اندر سے سامان نکال رہے تھے تو دیوار گر پڑی اور ایک چور اُس کے نیچے دب کر مر گیا۔ چوروں نے سامان وہیں چھوڑا اور اپنے ساتھی کی لاش لے کر راجا کے محل کے دروازے پر پہنچ گئے۔

صُبح کو راجا نے دربار لگایا تو وہ چور فریادی بن کر راجا کے حضور پیش ہوئے اور تینوں ایک ساتھ پکارے:

"دہائی ہے سرکار! حضور کے راج میں ہمارے ساتھ ظُلم ہوا ہے جو کسی کے ساتھ نہ ہوا ہو گا۔ ہم مارے گئے سرکار! تباہ ہو گئے، لٹ گئے!"

"تمہارے ساتھ کیا ظُلم ہوا ہے؟ کھول کر بیان کرو۔ ہم تمہارے ساتھ پورا پورا انصاف کریں گے۔" راجا نے کہا۔

"حضور، مائی باپ! ہم چور ہیں۔ رات کو مکانوں میں نقب لگانا اور چوری کرنا ہمارا

پیشہ ہے۔ رات ہم نے ایک مکان کی پچھلی دیوار میں نقب لگائی، لیکن مکان سے سامان نکال رہے تھے کہ دیوار گر پڑی اور ہمارا ایک ساتھی اُس کے نیچے دب کر مر گیا۔ دہائی ہے سرکار!"

"واقعی تم لوگوں کے ساتھ بڑا ظُلم ہوا ہے۔" راجا نے کہا۔ "چوب دار!" چوب دار آگے بڑھ کے آداب بجالایا اور بولا۔ "حکم سرکار!"

"اس مکان کے مالک کو حاضر کیا جائے۔"

چوب دار چند سپاہیوں کے ساتھ گیا اور مالک مکان کو پکڑ لایا۔ راجا نے اُسے دیکھتے ہی غصّے سے کہا: "تو نے اپنے مکان کی دیوار اِتنی کمزور کیوں بنائی کہ چوروں کا ایک ساتھی اُس کے نیچے دب کر مر گیا؟ بول! جواب دے!"

مالک مکان نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا۔ "حضور، مائی باپ! اِس میں میری کیا خطا ہے۔ دیوار میں نے اپنے ہاتھ سے تو نہیں بنائی۔ یہ تو اُس مستری کا کام ہے جس نے میرا مکان بنایا تھا۔ وہی حضور کے سوال کا جواب دے سکتا ہے۔" "اچھا!"

راجانے کہا۔ ”چوب دار!“

چوب دار فوراً آگے بڑھ کر آداب بجالایااور بولا۔ ”حکم سرکار!“

”اُس مستری کو حاضر کیا جائے۔“ چوب دار پھر چند سپاہیوں کے ساتھ گیا اور مستری کو پکڑ لایا۔ راجانے اُسے دیکھتے ہی غصّے سے کہا، ”تُو نے مکان کی دیوار اتنی کمزور کیوں بنائی کہ چوروں کا ایک ساتھی اُس کے نیچے دب کر مر گیا؟ بول! جواب دے؟“

مستری نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا ”حضور مائی باپ! اِس میں میرا کیا قصور ہے۔ یہ تو گارا تیّار کرنے والے مزدور کا قصور ہے۔ اُس نے گارا اتنا نرم بنا دیا تھا کہ دیوار کمزور رہ گئی۔“

”اچھا!“ راجانے یہ سُن کر کہا۔ ”چرب دار!“ چوب دار فوراً آگے بڑھ کر آداب بجالایااور بولا۔ ”حکم سرکار!“

”اس گارا تیّار کرنے والے مزدور کو حاضر کیا جائے۔“ چوب دار پھر چند سپاہیوں

کے ساتھ گیا اور اس مزدور کو پکڑ لایا۔ راجا نے اُسے دیکھتے ہی غصّے سے کہا۔

"تو نے گارا اتنا نرم کیوں بنایا تھا کہ دیوار کمزور رہ گئی اور چوروں کا ایک ساتھی اُس کے نیچے دب کر مر گیا؟ بول! جواب دے!"

مزدور نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا۔ "حضور، مائی باپ! اس میں میری کیا خطا ہے۔ یہ تو اُس سے کا قصور ہے جس نے گارے میں زیادہ پانی ڈال دیا تھا۔"

"اچھا!" راجا نے یہ سُن کر کہا۔ "چوب دار!" چوب دار فوراً آگے بڑھ کر آداب بجالایا اور بولا۔ "حکم سرکار!"

"سقّے کو حاضر کیا جائے!"

چوب دار پھر چند سپاہیوں کے ساتھ گیا اور سقّے کو پکڑ لایا۔ راجا نے اُسے دیکھتے ہی غصّے سے کہا۔ "تو نے گارے میں اتنا پانی کیوں ڈال دیا تھا کہ وہ نرم رہ گیا اور دیوار اِتنی کمزور بنی کہ چوروں کا ایک ساتھی اُس کے نیچے دب کر مر گیا؟ بول! جواب دے؟"

سقّے نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا "حضور، مائی باپ! اس میں میری کوئی خطا نہیں۔ میں تو مشک سے آہستہ آہستہ پانی ڈال رہا تھا کہ ایک مست ہاتھی میرے قریب سے گزرا۔ ڈر کے مارے مشک میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور سارا پانی نیچے جا گِرا۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ ہاتھی کے مہاوت کا قصور ہے، جس نے اپنے ہاتھی کو قابو میں نہیں رکھا۔"

"اچھا!" راجا نے یہ سُن کر کہا۔ "چوب دار!"

چوب دار فوراً آگے بڑھ کر آداب بجالایا اور بولا۔ "حکم سرکار!"

"مہاوت کو حاضر کیا جائے۔"

چوب دار پھر چند سپاہیوں کے ساتھ گیا اور مہاوت کو پکڑ لایا۔ راجا نے اُسے دیکھتے ہی غصّے سے کہا۔ "تو نے اپنے ہاتھی کو قابو میں کیوں نہیں رکھا کہ اِس کے مست ہو جانے کی وجہ سے پانی کی مشک سقّے کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور گارا نرم ہو گیا اور اِس طرح سے دیوار اتنی کمزور بنی کہ چوروں کا ایک ساتھی نیچے دب کر مر

گیا؟ بول! جواب دے!"

مہاوت نے ہاتھ باندھ کر عرض کی۔ "حضور، مائی باپ! اِس میں میری کوئی خطا نہیں ہے۔ میں تو روز ہاتھی کو بازار کی سیر کرانے نکلتا ہوں اور وہ کبھی مست نہیں ہوا۔ اس دِن میں ہاتھی کو بازار کی سیر کرا رہا تھا کہ ایک نوجوان عورت پاؤں میں جھانجھنیں پہنے ہوئے ہاتھی کے پاس سے گزری۔ اُن کی چھَن چھَن کی آواز سے ہاتھی مست ہو گیا۔ میرا کوئی قصور نہیں۔ قصور اُس عورت کا ہے جو جھانجھنیں پہنے ہاتھی کے پاس سے گزری تھی۔"

"اچھا!" راجا نے یہ سُن کر کہا۔ "چوب دار!"

چوب دار آگے بڑھ کر آداب بجالایا اور بولا۔ "حکم سرکار۔"

"اُس عورت کو حاضر کیا جائے!"

چوب دار پھر چند سپاہیوں کے ساتھ گیا اور اُس عورت کو پکڑ لایا۔ راجا نے اُسے دیکھتے ہی غصّے سے کہا "تو جھانجھنیں پہن کر ہاتھی کے پاس سے کیوں گزری تھی

کہ ہاتھی مست ہو گیا اور ڈر کے مارے سقّے کے ہاتھ سے مشک چھُوٹ گئی، سارا پانی نیچے جا گرا، گارا نرم رہ گیا اور اِس طرح دیوار اتنی کمزور بنی کہ چوروں کا ایک ساتھی اُس کے نیچے دب کر مر گیا؟ بول! جواب دے!"

عورت نے ہاتھ باندھ کر عرض کی "حضور، مائی باپ! اس میں میرا کیا قصور ہے۔ یہ تو سُنار کا قصور ہے جس نے مُجھے ایسی چھَن چھَن کرنے والی جھانجھنیں بنا کر دی ہیں۔"

"اچھا!" راجا نے یہ سُن کر کہا "چوب دار!"

چوب دار فوراً آگے بڑھ کے آداب بجالایا اور بولا "حکم سرکار!" "سُنار کو حاضر کیا جائے!"

چوب دار پھر چند سپاہیوں کے ساتھ گیا اور سُنار کو پکڑ لایا۔ راجا نے اُسے دیکھتے ہی غصّے سے کہا۔ "تو نے اِس عورت کو ایسی جھانجھنیں کیوں بنا کر دی تھیں کہ اُن کی چھَن چھَن سے ہاتھی مست ہو گیا اور ڈر کے مارے سقّے کے ہاتھ سے پانی کی مشک

چھوٹ گئی، سارا پانی نیچے گر پڑا، گارا نرم رہ گیا اور اس طرح سے دیوار اتنی کمزور بنی کہ چوروں کا ایک ساتھی اُس کے نیچے دب کر مر گیا؟ بول! جواب دے!"

سُنار بے چارہ دُبلا پتلا اور مریل سا آدمی تھا۔ راجا نے غصّے بھرے لہجے میں بات کی تو اُس کی گھگھّی بندھ گئی۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا "۔۔۔۔ حضُور۔۔۔۔ حضُور۔۔۔ "لیکن اس سے زیادہ کوئی بات اس کے مُنہ سے نہ نکل سکی۔ راجا غصّے سے گرجا۔ "یہی شخص مجرم ہے۔ لے جاؤ اُسے اور ابھی پھانسی دے دو۔ ہم انصاف کے معاملے میں ذرا سی دیر بھی نہیں کرنا چاہتے۔"

سپاہیوں نے سُنار کو پکڑا اور پھانسی کے تختے کی طرف لے گئے۔ لیکن جب اُس کے گلے میں پھندا ڈالنے گئے تو معلوم ہوا کہ وہ اس کے گلے میں ڈھیلا رہتا ہے۔ ظاہر ہے اس طرح سُنار کو پھانسی نہیں دی جا سکتی تھی۔

جلّاد راجا کی خدمت میں حاضر ہوا اور آداب بجالا کر بولا "سرکار! مُجرم بُہت دُبلا پتلا اور مریل سا آدمی ہے۔ پھانسی کا پھندا اُس کے گلے میں پورا نہیں آتا۔"

”اچھا!“ راجا نے کہا۔ ”تو ایسا کرو کہ جس شخص کے گلے میں یہ پھندا پورا آ جائے، اُسے پھانسی دے دو۔ فوراً، اسی وقت۔ ہم انصاف کے معاملے میں ذرا دیر بھی برداشت نہیں کر سکتے۔“

سپاہیوں نے سُنار کو پھانسی کے تختے سے اُتار دیا اور دربار میں جتنے لوگ اِس مقدمے کا فیصلہ سُننے کے لیے آئے ہوئے تھے اُن میں سے ہر ایک کے گلے میں باری باری پھندا ڈال کر دیکھا۔ پھندا کسی کے گلے میں بھی پوری طرح نہیں آتا تھا۔ کسی کی گردن میں ڈھیلا رہتا تھا اور کسی کی گردن میں آتا ہی نہیں تھا۔

سپاہیوں نے راجا کی خدمت میں آداب بجالا کر کہا۔ ”سرکار! یہاں ایک آدمی بھی ایسا نہیں ہے جس کے گلے میں پوری طرح آتا ہو۔“

”اچھا!“ راجا نے کہا۔ ”تو شہر سے کسی ایسے آدمی کو ڈھونڈ کر لاؤ جس کے گلے میں پھندا پوری طرح آتا ہو۔ جاؤ، فوراً جاؤ، ہم انصاف کے معاملے میں ذرا بھی دیر نہیں کرنا چاہتے۔“

سپاہی فوراً شہر کی طرف گئے اور جو شخص سامنے آیا، پھندا اُس کے گلے میں ڈال کر دیکھتے رہے۔ بد قسمتی سے رامو چوک کی ایک دُکان پر کھڑا حلوا کھا رہا تھا کہ سپاہی پھندا لیے ہوئے آ پہنچے۔ اُنہوں نے پھندا اُس کے گلے میں ڈال کر دیکھا تو وہ اُس کی گردن میں پورا آ گیا اور سپاہی اُسے کھینچ کر راجا کے دربار میں لے گئے۔ راجا کے سپاہیوں نے بتایا کہ پھندا اُس کی گردن میں پورا آ گیا ہے تو اُس نے کہا:

"ٹھیک ہے۔ اِس شخص کو فوراً پھانسی دے دی جائے۔ ہم انصاف کے معاملے میں ذرا سی دیر بھی نہیں کرنا چاہتے۔"

"حضور! میرا قصور کیا ہے؟" رامو نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"تمہارا قصور یہ سب لوگ جانتے ہیں۔ سارا شہر جانتا ہے۔ رات چوروں نے ایک مکان میں نقب لگائی تھی۔ اُس کی دیوار اِتنی کمزور تھی کہ وہ گر پڑی اور چوروں کا ایک ساتھی اُس کے نیچے دب کر مر گیا۔ چور انصاف کے لیے ہمارے دربار میں آئے۔ ہم نے مالِک مکان کو بُلایا اور اُس سے پوچھا کہ تُو نے اپنے مکان کی دیوار

اتنی کمزور کیوں بنائی کہ چوروں کا ایک ساتھی اُس کے نیچے دب کر مر گیا۔ مالک مکان نے جواب دیا کہ یہ تو مکان تعمیر کرنے والے مستری کا قصُور ہے۔ ہم نے مستری کو طلب کیا اور اُس سے پوچھا کہ تُو نے مکان کی دیوار اتنی کمزور کیوں بنائی کہ چوروں کا ایک ساتھی اُس کے نیچے دب کر مر گیا۔ مستری نے جواب دیا کہ یہ تو گارا بنانے والے مزدور کا قصُور ہے۔ اس نے گارا اتنا نرم بنایا کہ دیوار کمزور رہ گئی۔ ہم نے مزدور کو طلب کیا اور اُس سے پوچھا تو اُس نے جواب دیا کہ یہ اس مہاوت کا قصُور ہے جس کا ہاتھی مست ہو کر میرے قریب سے گزرا تھا اور مارے گھبراہٹ کے مشک میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی اور اُس کا سارا پانی گارے میں جا گرا تھا۔ ہم نے ہاتھی کے مہاوت کو طلب کیا اور اُس سے پوچھا کہ تو نے اپنے ہاتھی کو قابو میں کیوں نہیں رکھا، تو اُس نے جواب دیا کہ یہ تو اس عورت کا قصُور ہے جو پاؤں میں جھانجھنیں پہنے ہوئے ہاتھی کے پاس سے گزری اور اُن کی چھَن چھَن کی آواز سے ہاتھی مست ہو گیا۔ ہم نے اُس عورت کو طلب کیا اور اس سے پوچھا کہ تو جھانجھنیں پہن کر ہاتھی کے پاس سے کیوں گزری تھی تو اُس

نے جواب دیا کہ یہ تو سُنار کا قصُور ہے جس نے مُجھے ایسی جھانجھنیں بنا کر دی ہیں۔ ہم نے سُنار کو طلب کیا اور اُس سے پوچھا کہ تو نے اس عورت کو ایسی جھانجھنیں بنا کر کیوں دیں کہ اُن کی چھَن چھَن سے ہاتھی مست ہو گیا تو وہ ہمارے سوال کا جواب نہ دے سکا اور ہم نے حکم دیا کہ اُس کو اِسی وقت پھانسی دے دی جائے اس لیے کہ ہم انصاف کے معاملے میں ذرا سی دیر بھی نہیں کرنا چاہتے۔ لیکن جب سپاہیوں نے شکار کو پھانسی دینے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ پھانسی کا پھندا اُس کے گلے میں ڈھیلا رہتا ہے۔ سپاہیوں نے ہمیں یہ بتایا تو ہم نے حکم دیا کہ دربار میں جو آدمی موجود ہیں، اُن میں سے جس شخص کے گلے میں پھندا پورا آئے اُسے پھانسی دے دو۔ سپاہیوں نے دربار میں موجود تمام لوگوں کے گلے میں باری باری پھندا ڈال کر دیکھا لیکن کسی کے گلے میں بھی پورا نہ آیا۔ سپاہیوں نے ہمیں یہ بات بتائی تو ہم نے حکم دیا کہ شہر سے کسی ایسے آدمی کو ڈھونڈ لاؤ جس کے گلے میں پھندا پوری طرح آتا ہو، اور سپاہیوں کو سارے شہر میں ایک تم ہی ایسے ہی ملے ہو جس کی گردن میں پھندا پورا آتا ہے۔ اِس لیے

ہمارا حکم ہے کہ انصاف کے تقاضے کے مطابق تمہیں اِسی وقت پھانسی دے دی جائے۔ ہم انصاف کے سلسلے میں ذرا سی دیر بھی نہیں کرنا چاہتے۔"

راجا نے یہ کہہ کر خاموشی اختیار کی اور دربار میں موجود لوگوں کی طرف بڑی شان سے دیکھا۔ لوگوں نے راجا کے انصاف کی داد دیتے ہوئے زور زور سے تالیاں بجائیں۔ رامُو نے کُچھ کہنا چاہا لیکن اُس کی آواز تالیوں کے شور میں دب کر رہ گئی۔ جلد ہی اُسے محسوس ہو گیا کہ یہ اندھیر نگری ہے اور اندھیر نگری کا انسان ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ اب اُسے معلوم ہوا کہ اُس کے گرو سارنگ بابا نے کیوں کہا تھا کہ اِس جگہ رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔

جب تالیوں کا شور ختم ہوا تو راجا نے دوبارہ حکم دیا، "اُسے ابھی ہماری آنکھوں کے سامنے پھانسی دے دو۔ ہم انصاف کے سلسلے میں ذرا سی دیر بھی نہیں کرنا چاہتے۔"

رامُو نے ہاتھ جوڑتے ہوئے عرض کی "مہاراج! میں آپ کے انصاف اور آپ

کے حکم کے آگے سر جھکاتا ہوں، لیکن میری ایک درخواست ہے۔"

"کہو!"

"حضُور! میں اس شہر میں اپنے گرو کے ساتھ آیا تھا اور وہ مُجھے یہاں چھوڑ کر آگے چلے گئے تھے۔ میں چاہتا ہوں کہ مرنے سے پہلے ایک بار اُن کے درشن کر لوں۔ مُجھے مرنے سے پہلے اُن کے درشن ہو جائیں تو حضُور کا بہت بڑا احسان ہو گا۔"

"اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو اچھا۔" راجا نے کہا "ہم اِس کے لیے تمہیں کُچھ دِنوں کی مہلت دے سکتے ہیں۔ لیکن اپنے گرو کو یہاں بُلوانے کا بندوبست تمہیں خود کرنا ہو گا۔ آج بُدھ کا دِن ہے۔ تمہیں اگلے بُدھ تک کی مہلت دی جاتی ہے۔"

"بُہت بُہت مہربانی، مہاراج۔" رامُو نے کہا۔ "میں خود اپنے گرو تک اِطّلاع پہنچانے کا کوئی بندوبست کر لوں گا۔"

یہ کہہ کر رامُو نے دربار میں کھڑے ہوئے لوگوں کی طرف نظر کی۔ شاید وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اُن میں سے کس شخص کو اپنے گرو کے پاس بھیجنے کے لیے کہے۔ سب اِسی شہر کے لوگ تھے اور اس کا تماشا دیکھنے آئے تھے۔ کسی کے چہرے پر اُس کے لیے افسوس یا ہمدردی کے جذبات نہ تھے۔ آخر اُس کی نظریں ایک ایک چہرے پر سے ہوتی ہوئی میرے چہرے پر آکر جم گئیں۔ میرے ایک ہاتھ میں بِین تھی اور میں دوسرے لوگوں سے ذرا ہٹ کہ دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

رامُو تھوڑی دیر تک میری طرف دیکھتا رہا۔ اُس کی نگاہوں سے لجاجت اور منّت سماجت ٹپک رہی تھی۔ اُس نے میری طرف دیکھتے ہوئے دونوں ہاتھ جوڑ دیے اور مُجھے اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ میں اُس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ وہ بڑی عاجزی سے کہنے لگا:

”جوگی جی مہاراج! کیا آپ اپنے بھائی کے کام نہیں آئیں گے؟“

میں یہ الفاظ سُن کر حیران سا ہو گیا۔ کسی نے آج تک اِس طرح مُجھے مخاطب نہیں کیا تھا۔ میں نے کہا:

"دیکھو میاں! نہ میں جوگی ہوں نہ مہاراج۔ میرا نام انوشا ہے۔۔۔۔۔۔"

"انوشا جی مہاراج!" رامُو نے گِڑگِڑاتے ہوئے کہا۔ "کسی طرح سارنگ بابا کو میرے حال کی خبر کر دیجیے۔ میں زندگی بھر آپ کا احسان نہیں بھولوں گا۔ اگلے جہان میں بھی نہیں بھولوں گا۔"

"سارنگ بابا کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"تنکشک ناگ کا مندر تو آپ نے دیکھا ہو گا مہاراج۔"

"دیکھا ہے۔ میں وہیں رہتا ہوں۔ مندر کے پروہت کی بیوی میری خالہ ہے۔"

یہ سُن کر رامُو نے ایک دم میرے دونوں ہاتھ تھام لیے اور کہنے لگا۔

"تو پھر مہاراج، یہ کام صرف آپ ہی کر سکتے ہیں۔ مندر کے پاس جو چشمہ ہے،

اُس کے قریب شمال میں ایک پہاڑی ہے۔ اُس پہاڑی کے دوسری طرف کُچھ دُور آگے جا کر وادی میں ایک غار ہے۔ سارنگ مہاراج اُسی غار میں جاپ کر رہے ہوں گے۔ مُجھے اُنہوں نے یہی بتایا تھا۔ جیسے بھی ہو سکے، اُنہیں میری بپتا سے آگاہ کر دینا۔ راجا نے اگلے بُدھ تک کی مُہلت دی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اپنے گرو کے درشن کیے بنا اور اُن سے اپنی غلطیوں کی معافی مانگے بغیر اِس دُنیا سے چلا جاؤں۔ مہاراج! کیا آپ مُجھ غریب کے حال پر ترس کھائیں گے۔"

مجھے یہاں آئے صرف چند دِن ہوئے تھے اور یہ چند دِن بھی میں نے سفر کی تھکاوٹ دُور کرنے میں گزارے تھے۔ میں یہاں بالکل اجنبی تھا۔ مُجھے اِس علاقے کا پتا نہ تھا۔ لیکن نہ جانے کیسے یہ الفاظ میرے مُنہ سے نکل گئے۔

"حوصلہ رکھو۔ تمہارا پیغام سارنگ بابا تک پہنچ جائے گا۔"

یہ کہہ کر میں تیزی سے راجا انبارائی کے دربار سے نکل گیا۔ مندر کی طرف واپس جاتے ہوئے وہ الفاظ بار بار میرے ذہن میں گونج رہے تھے جو میں نے رامُو سے

کہے تھے۔ نہ جانے کیوں، بار بار مُجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ الفاظ کسی غیبی طاقت نے میرے مُنہ سے کہلوائے ہیں۔

سارنگ بابا

غیبی طاقت کے متعلّق میرا احساس شاید کُچھ اتنا نہ تھا۔ واپس اپنی خالہ کے پاس پہنچ کر میں نے جلد جلدی کھانا کھایا اور پھر خالہ کو کُچھ بتائے بغیر باہر نکل گیا۔

چشمے پر پہنچ کر میں نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ اُس کے شمال میں واقعی ایک پہاڑی نظر آ رہی تھی۔ میرے قدم خود بخود اُس کی طرف اُٹھنے لگے۔ لیکن یوں لگتا تھا جیسے میں چل نہیں رہا بلکہ ہوا میں اُڑ رہا ہوں۔

پہاڑی کی چوٹی تک کا فاصلہ کسی صورت بھی آٹھ کوس سے کم نہ تھا۔ لیکن جب میں چوٹی پر پہنچا تو تھکاوٹ کا ذرا بھی احساس نہ تھا اور نہ میرا سانس پھولا تھا۔

معلوم ہو رہا تھا جیسے میں آٹھ کوس نہیں، محض آٹھ دس قدم چلا ہوں۔ اپنی اس حالت پر مُجھے خود حیرانگی ہو رہی تھی۔

پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ کر میں نے نیچے دیکھا۔ دادی کا خوبصورت منظر تھا۔ اِسی وادی کے کسی غار میں سارنگ بابا جاپ کر رہے تھے اور مجھے اُنہیں رامُو کا پیغام پہنچانا تھا۔ مُجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ غار کہاں ہے، کِس طرف ہے اور کتنی دور ہے۔ لیکن اب مُجھے یقین ہو چکا تھا کہ اِس وقت میں کسی غیبی طاقت کے زیرِ اثر ہوں اور وہی طاقت غار کی طرف میری رہنمائی کر رہی ہے۔ میں دم بھر کو رُکا اور پھر نیچے پہاڑی کی چوٹی اُترنے لگا۔

جیسے ہی میں وادی میں داخل ہوا، ایک عجیب و غریب بُو میرے نتھنوں سے ٹکرائی۔ نہ جانے یہ کِس کی اور کیسی بو تھی کہ مُجھ پر نشے کی سی حالت طاری ہونے لگی۔ میرے قدم برابر اُٹھ رہے تھے لیکن مُجھے جیسے اپنے آپ کا ہوش نہ تھا۔

مُجھے کُچھ اندازہ نہیں کہ میں کتنی دیر تک اِس بے ہوشی کی سی حالت میں رہا۔ اِس

مدہوشی کی حالت میں مَیں نے کتنا سفر کیا؟ مُجھے کُچھ معلوم نہیں۔ پھر اچانک مُجھے ایک زور کی پھُنکار سُنائی دی۔ میرے قدم خود بخود رُک گئے۔ مدہوشی کی حالت ایک دم ختم ہو گئی۔ میں نے چونک کر سامنے دیکھا۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک غار کا دروازہ دکھائی دے رہا تھا اور اُس غار کے دروازے پر ایک بھاری بھر کم ناگ کُنڈلی مارے اور بِین اُٹھائے پہرا دے رہا تھا۔ وہ زور دار پھُنکار جو میں نے سُنی تھی، اُسی ناگ کی تھی۔

ناگ کو دیکھتے ہی میرے ہاتھ حرکت میں آئے اور میں نے اپنی بِین ہونٹوں سے لگا لی۔ لیکن ابھی بجانے نہ پایا تھا کہ غار کے اندر سے ایک گونج دار آواز بُلند ہوئی۔

"ٹھہرو! اِس کی ضرورت نہیں ہے۔ اندر چلے آؤ۔"

یہ آواز بڑی ہی رُعب دار تھی۔ میں نے بِین ہونٹوں سے ہٹا لی اور ناگ کے پاس سے ہو کر غار کے اندر داخل ہو گیا۔ پھر میری آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ

گئیں۔

میرا خیال تھا کہ غار کے اندر اندھیرا ہو گا لیکن وہاں تو ایسی روشنی تھی جیسے کسی کھُلی جگہ پر دِن کا اُجالا پھیلا ہوا ہو۔ یہ غار خاصا وسیع تھا۔ اُس کی چھت بھی خاصی اُونچی تھی۔ اُس کے عین درمیان میں ایک جوگی آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اُس کی لمبی لمبی جٹائیں اور ناف کو چھُوتی ہوئی سفید ڈاڑھی دیکھ کر ہیبت طاری ہوتی تھی۔ اُس کی بڑی بڑی روشن آنکھیں جیسے مُجھے گھور رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے اُس کی نگاہیں میرے دِل میں تیر کی طرح گڑی جا رہی ہیں۔ یقیناً یہ سارنگ بابا ہی تھے۔ "سارنگ مہاراج!" میں نے کہا اور پھر دونوں ہاتھ جوڑ کر اُنہیں سلام کیا۔

سارنگ بابا نے میرے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے "تم انوشا ہو؟"

"جی مہاراج۔"

"اور پشکلاوتی سے آئے ہو؟"

"جی مہاراج"

”دس سال وہاں رہے ہو؟“

”جی مہاراج۔“

”شیش ناگ کے مندر میں؟“

”جی مہاراج۔“

سارنگ بابا نے اطمینان کا سانس لیا اور کہنے لگے۔ ”شکر ہے میری محنت ٹھکانے لگی۔ میں نے یہاں آکر مہاراج کے نام کا جاپ کیا تھا اور اُن سے کوئی چیلا مانگا تھا جو سچ مُچ میرا چیلا ثابت ہو سکے۔ اِس جاپ کا انعام تُم ہو۔ مُجھے تمہارے متعلّق سب بتا دیا گیا ہے۔ مُجھے معلوم ہے کہ تم دس سال تک شیش ناگ کے سائے میں رہے ہو۔ میں جانتا ہوں کہ تمہاری سیٹی اور بِین کی آواز پر سانپ لوٹ پوٹ ہونے لگتے ہیں۔ یہ سب کُچھ مُجھے تکشک مہاراج نے بتا دیا تھا۔ تم یہاں تکشک مہاراج کے سائے میں آئے ہو اور اُنہوں نے تمہیں میرے حوالے کر دیا ہے۔ اب تم میں چیلے ہو۔ میرے ساتھ رہو گے۔ میں تمہیں وہ سب سِکھا دوں گا جو

میں نے سیکھا ہے۔ وہ تمام دولت تمہارے دامن میں ڈال دوں گا جو میرے دامن میں ہے۔ میں تمہیں وہ کُچھ بنا دُوں گا جس کا تُم خیال بھی نہیں کر سکتے۔ میری آنکھیں تمہارے اندر چھُپے ہوئے جوہر صاف دیکھ رہی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تُم ایسے شاگرد ثابت ہو گے جو اُستاد کا نام روشن کرتے ہیں۔"

اتنا کہہ کر سارنگ بابا ذرا دیر کے لیے رُکے تو میں نے ڈرتے ڈرتے کہا:

"مہاراج، میں تو یہاں رامُو کے سلسلے میں حاضر ہوا ہوں۔"

"رامُو!" سارنگ بابا نے حیرانی سے کہا۔ "کیا ہوا اُسے؟ کہیں حلوا کھا کھا کر اُس کا پیٹ تو نہیں پھَٹ گیا۔"

"نہیں مہاراج۔" میں نے کہا۔ "بات کُچھ اَور ہے لیکن آپ تو اتنے پہنچے ہوئے جوگی ہیں۔ آپ کو اُس کے حال کی خبر ہونی چاہیے تھی۔" کہنے کو تو میں نے یہ بات کہہ دی، لیکن ساتھ ہی خیال آیا کہ سارنگ بابا بُرا مان جائیں گے۔ کیوں کہ میں نے ایک طرح سے اُن پر چوٹ کی تھی۔ لیکن میری حیرت کی حد نہ رہی

جب اُنہوں نے مُسکراتے ہوئے کہا:

"انوشا بیٹے، ہماری اپنی کوئی ہستی نہیں ہے۔ ہماری کوئی کرامت اپنی کرامت نہیں ہے۔ ہم صرف اتنا ہی جانتے ہیں جتنا قدرت کی طرف سے ہمیں بتایا جاتا ہے۔ یہ بات ہر گھڑی اور ہر وقت نہیں ہوتی۔ وہ ایک خاص وقت ہوتا ہے جب ہماری آنکھیں دیوتاؤں کی آنکھیں بن جاتی ہیں۔ ہمارے کان دیوتاؤں کے کان بن جاتے ہیں۔ لیکن چراغ تلے اندھیرا کی طرح کبھی ہمیں اپنے پاس کی بات کی بھی خبر نہیں ہوتی۔ سمجھ رہے ہو نا؟"

"جی مہاراج۔"

"تو بتاؤ رامُو پر کیا بپتا پڑی ہے؟"

میں نے شروع سے آخر تک سارا ماجرا کہہ سُنایا۔ وہ خاموشی سے سُنتے رہے اور جب میں اپنی بات ختم کر چکا تو بولے۔

"وہ سو مُورکھوں کا ایک مُورکھ ہے۔ وہ میرے بھائی کی نشانی ہے، اِس لیے

میرے دِل میں اُس کے لیے پیار ہی پیار ہے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ وہ کُچھ بن جائے۔ اُسے برابر اپنے ساتھ رکھا۔ اُسے بہت کُچھ سکھانے کی کوشش کی لیکن وہ نِرا چکنا گھڑا ثابت ہوا اور پرور پُور آکر تو وہ ٹکے سیر کھاجے پر ایسا ریجھا کہ میرے سمجھانے پر بھی اُسے سمجھ نہیں آئی۔ اِس لیے میں اُسے وہیں چھوڑ کر یہاں چلا آیا تھا اور اِس بات کے لیے جاپ کیا تھا کہ مُجھے کوئی لائق چیلا ملے۔ قُدرت نے تُجھے میرے پاس پہنچا دیا ہے۔ لیکن رامُو کے لیے بھی مُجھے کُچھ نہ کُچھ کرنا ہو گا۔ وہ میرے بھائی کی نشانی ہے۔"

اتنا کہہ کر سارنگ بابا سوچ میں ڈوب گئے۔ تھوڑی دیر بعد کہنے لگے۔ "میں چاہوں تو یہیں بیٹھے سب کُچھ ہو سکتا ہے۔ جس طرح تم یہاں آئے ہو، اِسی طرح رامُو کو بھی یہاں لایا جا سکتا ہے۔ کوئی چیز اُس کا راستہ نہیں روک سکے گی۔ لیکن مُورکھوں کے ساتھ مُورکھ بن کر ہی جیتا جا سکتا ہے۔ تم جا کر رامُو کو تسلّی دے دینا کہ وہ فکر نہ کرے۔ اگلے بُدھ کو ہم وہاں موجود ہوں گے۔ تُم بھی اور میں بھی اور پھر وہاں جو کُچھ ہو گا، وہ ایک دُنیا دیکھے گی۔"

تماشا

بُدھ کا دِن آیا تو جیسے ساری دُنیا رامُو کے پھانسی لگنے کا تماشا دیکھنے کے لیے اُمڈ آئی۔ راجا انبارائی کا دربار یوں کھچا کھچ بھر گیا کہ کہیں تِل دھرنے کو بھی جگہ نہ رہی۔ میں نے سارنگ بابا کی ہدایت کے مطابق رامُو کو بتا دیا تھا کہ اُسے کیا کرنا اور کیا کُچھ کہنا ہے۔ وہ پھانسی کے تختے پر نہایت اطمینان سے کھڑا اپنے گرو سارنگ بابا کا انتظار کر رہا تھا۔

کُچھ دیر بعد سارنگ بابا آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے ہوئے دربار میں داخل ہوئے اور سیدھے پھانسی کے تختے کی طرف بڑھے۔ جیسے ہی وہ قریب آئے، رامُو نے آگے

بڑھ کر اُن کے گھٹنوں کو ہاتھ لگائے اور پھر ایک دم چلّا اُٹھا۔

"جلدی کرو! جلدی سے مُجھے پھانسی لگا دو۔ ایسا وقت پھِر کبھی نہیں آئے گا۔"

"کیا بکتے ہو؟" سارنگ بابا رامُو کو جھڑکتے ہوئے بولے۔ "اِسے اُتار دو تختے سے اور مُجھے پھانسی لگا دو۔ میں یہ موقع گنوانا نہیں چاہتا۔"

"نہیں مہاراج۔ مجھے پھانسی لگ جانے دو۔"

"مُورکھ کہیں گے۔ تُم نہیں، میں پھانسی پر چڑھوں گا۔"

"نہیں مہاراج میں۔"

رامُو اور سارنگ بابا میں باقاعدہ تکرار ہونے لگی۔

رامُو چیخ چیخ کر کہتا کہ جلدی سے مُجھے پھانسی لگا دی جائے اور سارنگ بابا کہتے اِسے نہیں جلدی سے مُجھے پھانسی دے دی جائے۔ لوگ، جو رامُو کے پھانسی لگنے کا تماشا دیکھنے آئے تھے، اُن کے لیے گرو اور چیلے کی تکرار ایک تماشا بن گئی۔

گُرو اور چیلے کو آپس میں تکرار کرتے دیکھ کر راجا انبارائی ضبط نہ کر سکا۔ وہ تخت سے اُٹھ کر پھانسی کے تختے کے قریب آیا اور سارنگ بابا سے کہنے لگا۔

"کیا بات ہے، جوگی جی؟ یہ تم آپس میں تکرار کیوں کر رہے ہو؟"

"بات یہ ہے مہاراج۔" سارنگ بابا نے کہا "یہ وقت ایسا مُبارک ہے کہ اِس وقت جو بھی پھانسی پائے گا، بغیر کسی حساب کتاب کے سیدھا جنّت میں جائے گا۔ ایسا وقت سینکڑوں سال میں کہیں ایک بار آتا ہے۔ میں یہ موقع گنوانا نہیں چاہتا، آپ اپنے آدمیوں کو حکم دیں کہ وہ جلدی سے مُجھے پھانسی دے دیں۔

"نہیں مہاراج۔" رامُو چیخ اُٹھا۔ "پھانسی میں لگوں گا۔"

"چُپ کم بخت۔" سارنگ بابا نے اُسے ڈانٹا۔ "تجھے اپنے گُرو کی بات کاٹتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔ اپنے آدمیوں کو جلدی حکم دیجیے مہاراج کہ وہ دیر نہ کریں اور فوراً مجھے پھانسی دے دیں۔"

رامُو پھر کُچھ کہنے لگا تھا کہ راجا نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے خاموش کر دیا اور

وہ سارنگ بابا سے کہنے لگا۔

"کیا واقعی یہ بات سچ ہے کہ اِس وقت جو پھانسی لگے گا وہ بغیر حساب کتاب کے سیدھا جنّت میں جائے گا؟"

"مہاراج۔" سارنگ بابا نے کہا۔ "اگر مجھے اِس بات کا یقین نہ ہوتا تو میں اِس کے لیے تکرار کیوں کرتا۔ جلدی کیجیے مہاراج۔ اپنے آدمیوں کو حکم دیجیے کہ وہ مُجھے پھانسی پر چڑھا دیں۔ وقت ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔"

"ٹھہرو!" راجا انبارائی نے رُعب سے کہا۔ "تُم میں سے کسی کو بھی پھانسی نہیں دی جائے گی۔ ہم خود بغیر حساب کتاب کے جنّت میں جانا چاہتے ہیں۔ جلّاد! جلدی سے پھانسی کا پھندا ہماری گردن میں ڈال دو۔" جلّاد راجا کا یہ حکم سُن کر حیران رہ گیا۔ اُس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ اُس کو ہچکچاتے دیکھ کر راجا نے خود آگے بڑھ کر پھندا اُس کے ہاتھ سے لیا اور اپنے گلے میں ڈال لیا۔ پھندا ذرا سا ڈھیلا تھا۔ اِس پر راجا نے کہا۔

”ارے یہ تو ڈھیلا ہے۔ اب میں بغیر حساب کتاب جنّت میں کیسے جا سکوں گا؟ سارنگ بابا فوراً آگے بڑھے اور اُنہوں نے پھندے کی گرہ کو ذرا سا کس دیا۔ پھر بولے ”نہیں مہاراج۔ آپ کو دھوکا ہوا ہے پھندا تو بالکل ٹھیک ہے۔“

راجا انبارائی یہ سُن کر خوش ہو گیا۔ اُس نے ایک نظر دربار میں موجود لوگوں پر ڈالی، پھر جلّاد کو تختہ کھینچنے کا اشارہ کیا۔ سارنگ بابا اور رامو پیچھے ہٹ گئے اور جلّاد نے راجا کے قدموں کے نیچے سے تختہ کھینچ لیا۔ راجا کا جسم ذرا دیر کو تڑپا پھڑکا اور پھر اُس گردن ایک طرف کو لڑھک گئی۔ چند لمحوں بعد ہی راجا انبارائی کا بے جان جسم پھانسی کے رسّے کے ساتھ جھول رہا تھا۔

لوگ یوں حیران کھڑے تھے جیسے اُنہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا ہو۔ وہ تو رامُو کے پھانسی لگنے کا تماشا دیکھنے آئے تھے۔ اِس کے بجائے پہلے اُنہوں نے رامُو اور اُس کے گرو سارنگ بابا کو پھانسی لگنے کے لیے آپس میں تکرار کرتے دیکھا تھا اور پھر اُن کی نظروں کے سامنے خود راجا انبارائی پھانسی پر چڑھ گیا تھا۔

کُچھ دیر تک لوگ اِسی طرح کھڑے رہے۔ پھر وہ آپس میں کانا پھُوسی کرنے لگے۔ یہ کانا پھوسی بڑھتے بڑھتے ایک شور کی صورت اختیار کر گئی۔

"اب ہمارا راجا کون ہو گا؟ اب یہاں کون راج کرے گا؟" لوگ کہہ رہے تھے۔

سارنگ بابا اور رامُو پھانسی کے تختے کے پاس ہی کھڑے تھے۔ نہ جانے کیا بات ہوئی کہ سب لوگوں نے اُمّید بھری نگاہوں سے اُن کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ پھر ایک شخص جو شکل و صورت سے خاصا عزّت دار دکھائی دیتا تھا، آگے بڑھا۔ اُس نے قریب آکر سارنگ بابا کے گھٹنوں کو ہاتھ لگائے۔ پھر ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا۔

"مہاراج! آپ بڑی کرنی والے ہیں۔ مہربانی کر کے بتائیں کہ اب ہمارا راجا کون ہو گا۔ بزرگوں سے سُنا ہے کہ تخت کا خالی رہنا اچھا شگون نہیں ہوتا۔"

سارنگ بابا نے کُچھ سوچا اور پھر جیسے اُن کے دماغ میں بجلی سی کوند گئی۔ وہ دربار میں کھڑے ہوئے لوگوں وہ سے بولے:

”اے پرور پُور کے لوگو! سُنو اور غور سے سُنو! راجا کا تخت خالی نہیں رہے گا۔ آج سے میرا رامُو تمہارا راجا ہے۔“

سارنگ بابا کی یہ بات سُنتے ہی لوگ خوشی کے نعرے بُلند کرنے لگے۔ ذرا سی دیر میں رامُو کو جگ مگ، جگ مگ کرتا شاہی لباس اور قیمتی ہیروں والا تاج پہنا کر تخت پر بٹھا دیا گیا۔ پرور پُور کے لوگ جھک جھک کر اُس کے حضور آداب بجا لانے لگے۔ قسمت کے اس انقلاب پر رامو خُوش بھی تھا اور حیران بھی۔ وہ رہ رہ کر یہ سوچتا کہ کہیں یہ سب کُچھ خواب تو نہیں ہے۔ لیکن آخر اُسے یقین کرنا ہی پڑا کہ وہ سچ مُچ پرور پُور کا راجا بن گیا ہے۔

رامُو کو راجا بنا کر سارنگ بابا بہت خوش دکھائی ہے رہے تھے۔ رامُو اُن کے بھائی کی نشانی تھا۔ وہ اُسے اپنا لائق چیلا بنانا چاہتے تھے۔ لیکن اِس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ اب قسمت کی مہربانی سے اُنہوں نے رامُو کو اپنے چیلے کی بجائے پرور پُور کا راجا بنا دیا تھا۔ میں دربار کے ایک کونے میں کھڑا خاموشی سے یہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔ رامُو کو تخت پر بٹھانے کے بعد سارنگ بابا مُجھے ساتھ لے کر

وہاں سے چلے جانا چاہتے تھے، لیکن رامُو نے اصرار کر کے روک لیا۔ راجا انبارائی کی آخری رسمیں ادا ہونے تک ہم وہیں ٹھہرے رہے اور اُس کے بعد تکشک ناگ کے مندر کی طرف چل دیے۔

میرا خیال تھا کہ سارنگ بابا مندر میں جائیں گئے تو میں اپنی خالہ سے مل لوں گا۔ میں نے اُسے سارنگ بابا کے بارے میں سب کُچھ بتا دیا تھا۔ وہ مُجھے سارنگ بابا کا چیلا بننے سے تو روک نہیں سکتی تھی۔ وہ کیا میں خود بھی اپنے آپ کو اِس بارے میں بے بس پاتا تھا۔ لیکن وہ اپنی محبّت کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہ ضرور چاہتی تھی کہ کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ اُس کی بہن کی نشانی اُس کی نظروں کے سامنے رہے۔

لیکن میرا خیال صرف خیال ہی رہا۔ سارنگ بابا تکشک ناگ کے مندر میں جانے کے بجائے اُس کے قریب چشمے کے پاس سے ہوتے ہوئے اُس پہاڑی کی طرف بڑھ گئے جس کے دوسری طرف وادی میں وہ غار تھا جہاں اُنہوں نے میرے لیے جاپ کیا تھا۔ میں اُن کے ساتھ ساتھ خاموشی سے یوں چل رہا تھا جیسے کسی

نے مُجھ پر جادُو کر رکھا ہو۔

جب ہم غار کے نزدیک پہنچے تو شام ہو رہی تھی۔ غار کے دروازے پر میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ اب وہ بھاری کم ناگ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا، جسے میں نے پچھلی مرتبہ غار کے دروازے پر پہرا دیتے دیکھا تھا۔

"وہ۔۔۔۔وہ۔۔۔۔وہ ناگ کہاں ہے، مہاراج؟"

"سارنگ بابا ہنس کر بولے۔ "وہ اب یہاں نہیں ہے انوشا بیٹے۔ اپنا کام پورا کر کے چلا گیا۔"

"کام پورا کر کے؟" میں حیران رہ گیا۔

"ہاں بیٹے۔ وہ تکشک مہاراج کا بھیجا ہوا ناگ تھا اور اُس کا کام اُس روز تمہیں اِس غار تک پہنچانا تھا۔ کیا تمہیں وادی میں داخل ہوتے ہی ایک خاص قسم کی بُو محسوس نہیں ہوئی تھی؟"

”ہوئی تھی، مہاراج!“ میں نے کہا۔

”وہ بُو اِسی ناگ کے جسم کی تھی۔“ سارنگ بابا بولے۔ ”اسی بُو نے تمہیں اِس غار تک پہنچایا تھا، تم پر تکشک ناگ کا سایہ ہے نا۔ اُنہوں نے تمہیں مُجھ تک پہنچانے کے لیے یہ بندوبست کیا تھا۔ اب تم میرے چیلے ہو۔ میرے ساتھ رہو گئے۔“

یہ کہتے ہوئے سارنگ بابا نے میرا ہاتھ تھام لیا اور غار کے اندر داخل ہو گئے۔

اگلا دِن میرے لیے ایک ایسی زندگی کا پیغام لے کر آیا جس کا میں نے کبھی تصوّر بھی نہیں کیا تھا۔ میں اب سارنگ بابا کا چیلا تھا اور چیلا بھی ایسا جس کی خاطر اُنہوں نے تکشک ناگ کا جاپ کیا تھا۔ اِس سے میری اہمیّت ظاہر ہوتی تھی لیکن دس سال کا بچّہ بھلا اپنی اہمیّت کا احساس کیسے کر سکتا تھا۔ میں تو بس اتنا جانتا تھا کہ سارنگ بابا میرے گرو ہیں اور میں اُن کا چیلا۔ تکشک مہاراج نے مُجھے اُن کے سپرد کر دیا تھا اور اِسی احساس کے تحت میں اُن کے پیچھے پیچھے یوں چل رہا تھا جیسے کوئی پالتو کُتّا دُم ہلاتا ہوا اپنے مالک کے پیچھے چلتا ہے۔

غار سے نکل کر ہم دوپہر تک سفر کرتے رہے۔ دوپہر کے وقت ہم نے ایک چشمے کے کنارے تھوڑی دیر آرام کیا۔ درختوں کے پھل اور چشمے کا ٹھنڈا میٹھا پانی ہماری بھوک پیاس بجھانے کے لیے کافی تھے۔ تھوڑی دیر آرام کے بعد ہم نے دوبارہ سفر شروع کیا اور شام ہونے کے قریب ایک بستی میں جا پہنچے۔

ہم بستی میں داخل ہوئے ہی تھے کہ کُچھ لوگ گھبرائے گھبرائے ہماری طرف آئے۔ اُن میں سے ایک نے آگے بڑھ کر سارنگ بابا کے پاؤں چھوئے اور کہنے لگا۔

"مہاراج! آپ ٹھیک وقت پر آئے ہیں۔ جلدی چلیے۔ ہمارے مکھیا کے بڑے لڑکے کی حالت سخت خراب ہے۔ اُسے سانپ نے کاٹ لیا ہے۔"

سارنگ بابا کُچھ کہے بغیر اُن کے ساتھ ہو لیے۔ ذرا دیر بعد ہم بستی سے مکھیا کی حویلی میں داخل ہو چکے تھے۔ حویلی کے صحن میں ایک چارپائی بچھی تھی۔ اُس پر ایک نوجوان پڑا بُری طرح تڑپ رہا تھا۔ لوگ اُس کے گرد جمع تھے اور سب کے

چہرے غم اور فکر کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ اُس نوجوان کا باپ جو بستی کا مکھیا تھا، یوں دِل پر ہاتھ رکھے بیٹھا تھا جیسے اُس کا دِل ڈوبا جا رہا ہے۔ سارنگ بابا نے اشارے سے لوگوں کو ایک طرف ہٹا دیا اور ایک نظر نوجوان پر ڈالی۔ اُس کی پنڈلی پر وہ جگہ دیکھی جہاں سانپ نے کاٹا تھا۔ پھر چاقو سے اُس جگہ ذرا سا چیرا دیا اور اُس کے اندر اپنے مُنہ کا لعاب لگا دیا۔ پھر بولے "گھبراؤ نہیں میاں، یہ کوئی زہریلا سانپ نہیں تھا۔ لڑکا ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔" اور واقعی تھوڑی دیر بعد ہی وہ نوجوان اُٹھ بیٹھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی سانپ نے اُسے کاٹا ہی نہیں تھا۔ مکھیا سارنگ بابا کے قدموں میں گر گیا۔

"مہاراج! آپ بڑی کرنی والے ہیں۔ آپ نے میرے بیٹے کی جان بچا کر میری بھی جان بچا لی ہے۔"

پھر وہ بھاگا بھاگا اندر گیا اور چاندی کے سکّوں کی ایک تھیلی لا کر سارنگ بابا کی طرف بڑھا دی۔

”یہ میری طرف سے قبول فرمایئے۔“

”تم اپنی چاندی اپنے پاس رکھو۔“ سارنگ بابا بولے۔ ”یا اِسے اپنے بیٹے کے سر پر سے وار کہ غریبوں میں بانٹ دو۔ ہم جوگی لوگوں کا دولت سے کیا کام۔ ہم تو اُڑتے پنچھی ہیں۔“

مُکھیا نے اُسی وقت وہ تھیلی اپنے بیٹے کے سر سے وار کر بستی کے غریب لوگوں میں بانٹ دی۔ پھر اُس نے اصرار کر کے ہمیں نہایت عزّت کے ساتھ اپنی حویلی میں ٹھہرایا۔

ہمارے بستر حویلی کے ایک الگ تھلگ حصّے میں لگائے گئے تھے۔ سارنگ بابا نے جس طرح اپنے لعاب سے مُکھیا کے نوجوان بیٹے کو ٹھیک کر دیا تھا، اس سے میں حیران رہ گیا تھا۔ رات کے وقت میں نے ہمّت کر کے یہ بات بابا سے پوچھ ہی لی۔

”آپ نے کمال کر دیا بابا جی۔ ذرا سا تھوک لگایا اور وہ نوجوان ٹھیک ہو گیا۔“

”آدھی عُمر گنوا کر ہم نے یہ کمال حاصل کیا ہے بیٹے۔ زہر کو زہر ہی مارتا ہے۔“

”تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کا تھُوک زہر ہے؟“

سارنگ بابا ہنس دیے اور بولے ”تم تھوک کی بات کرتے ہو بیٹے۔ اب تمہیں کیا بتائیں کہ شیش ناگ، تکشک ناگ، واسُکی اور نہ جانے کِس کِس ناگ کا زہر ہماری رگوں میں خُون بن کر دوڑ رہا ہے۔ ہم اب تک در چار یا دس بیس نہیں، سینکڑوں ناگوں کا زہر اپنے بدن میں اُتار چکے ہیں اور ابھی یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ جوانی میں ناگ کا زہر ہی اپنی سب سے بڑی خوراک رہی ہے۔“

”میں کُچھ نہیں سمجھا، مہاراج۔“

”وقت آنے پر خود بخود سمجھ جاؤ گے۔ ابھی تمہاری عُمر ہی کیا ہے۔“

میں خاموش ہو رہا۔ میری حیرانی دُور ہونے کی جگہ اور بڑھ گئی تھی لیکن میں نے اپنے آپ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

”انوشا بیٹے، اپنی حیرانی پر قابو پانا سیکھو۔ سارنگ بابا کے ساتھ رہ کہ ابھی تمہیں بہت کُچھ دیکھنا ہے۔ اُن کا چیلا بننے کے بعد اُن سے بہت، کُچھ سیکھنا ہے۔“

میں کُچھ دیر ہی سویا ہوں گا کہ یوں محسوس ہوا جیسے کوئی میرا شانہ زور زور سے ہلا رہا ہے۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ سارنگ بابا مُجھ پر جھُکے ہوئے تھے اور میرا شانہ ہلاتے ہوئے آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے۔

"انوشا بیٹے! انوشا بیٹے! اُٹھو ذرا باہر چلیں۔"

ہم حویلی سے باہر نکلے اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے بستی سے باہر آ گئے۔ رات اندھیری تھی، آسمان پر تاروں کی مدھم مدھم روشنی تھی۔ لیکن اِس کے باوجود سارنگ بابا کے قدم یوں اُٹھ رہے تھے جیسے اُن کے لیے رات کی تاریکی بھی دِن کے اُجالے کی طرح ہے اور حیرت کی بات یہ تھی کہ اُن کے ساتھ چلتے ہوئے مُجھے بھی راستہ دِن کے اُجالے کی طرح دِکھائی دے رہا تھا۔

ہم چلتے ہوئے دریا کے کنارے جا پہنچے۔ یہ ایک چھوٹا دریا تھا۔ دریا کے کنارے پہنچ کر سارنگ بابا بولے۔

"انوشا بیٹے! ذرا بِین تو بجاؤ۔ ہم بھی تمہارا ہنر دیکھیں۔" بِین میرے بائیں ہاتھ

میں تھی۔ میں نے بِین ہونٹوں لگائی اور بجانے لگا۔ ذرا سی دیر بعد ہی پانی میں شپا شپ کی آواز آنے لگی۔ یوں لگتا تھا جیسے دریا میں بیسیوں سانپ پھِر رہے ہیں۔ میں اپنی دُھن میں بِین بجائے جا رہا تھا سارنگ بابا نے لپک کر بِین مُجھ سے چھین لی اور خود بجانے لگے:

سارنگ بابا کا بِین بجانے کا انداز اور ہی تھا۔ یہ ایک ایسی لَے تھی جس سے میں اب تک بالکل بے خبر تھا۔ میرے کان بِین کی آواز پر تھے اور نظریں سامنے دریا کے پانی پر جمی تھیں۔

کنارے کے قریب دریا کے پانی کا کُچھ حصّہ یوں چمک رہا تھا جیسے سورج کی کرنیں پڑ رہی ہیں۔ حال آں کہ اُس وقت آسمان پر سورج کے ہونے کا سوال ہی نہیں تھا۔ مگر دریا کے پانی کا کُچھ حصّہ ایک دائرے کی صورت میں برابر چمک رہا تھا۔

روشنی کے اِس دائرے میں یوں نظر آتا تھا جیسے ہزاروں سانپ جمع ہیں۔ پھر اُن میں سے ایک سانپ کا پھَن اُوپر کی طرف اُٹھا اور اُٹھتا ہی گیا۔ کُچھ دیر بعد یہ پھَن

پانی سے تین چار ہاتھ یُوں اُونچا ہو گیا جیسے پانی میں کوئی بانس گاڑ دیا گیا ہو یا کسی جادُو گر نے ہوا میں رسّا سیدھا کھڑا کر دیا ہو۔

پھر وہ سانپ آہستہ آہستہ ہماری طرف بڑھنے لگا۔ اِس حالت میں بھی اُس کا پھَن پانی سے تین چار ہاتھ اُوپر اُٹھا ہوا تھا۔ ذرا دیر بعد وہ ہمارے بالکل سامنے آ گیا۔ اُس کا پھَن سارنگ بابا کے چہرے کے بالکل قریب تھا۔ سارنگ بابا بین بجا رہے تھے۔ سانپ کا پھَن بِین کی لَے پر آہستہ آہستہ ہِل رہا تھا۔ لیکن اِس حالت میں بھی اُس کا نچلا دھڑ بانس کی طرح سیدھا تھا اور نہیں کہا جا سکتا تھا کہ ابھی اُس کے جسم کا کتنا حصّہ پانی کے اندر ہے۔

پھر سارنگ بابا نے اچانک بِین ہونٹوں سے ہٹا کر اپنی زبان باہر نکال دی۔ سانپ کی زبان بجلی کے کوندے کی طرح لپکی اور اُس نے سارنگ بابا کی زبان پر ڈس لیا۔

اس کے ساتھ ہی اِس نے زور کی پھنکار، اری۔ اُس پھُنکار میں ایسی گرمی تھی کہ اُس کے اثر سے مُجھے اپنا بدن جلتا ہوا محسوس ہوا۔ یوں لگا جیسے میں کسی دہکتی ہوئی

بھٹّی کے سامنے آ گیا ہوں۔ یہ گرمی ایسی نا قابلِ برداشت تھی کہ میں بے ہوش ہو گیا۔

خوفناک مقابلہ

جب مُجھے ہوش آیا اور میں نے آنکھیں کھول کر اپنے اِرد گرد دیکھا تو حیران رہ گیا۔ میں مکھیا کی حویلی میں اپنے بستر پہ تھا اور میرے قریب ہی سارنگ، بابا اپنے بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ باہر دِن کا اُجالا پھیلا ہوا تھا۔ میں سوچنے لگا کر رات کا ماجرا ایک حقیقت تھی یا میں نے کوئی خواب دیکھا ہے!

دِن چڑھا تو سارنگ بابا نے مکھیا سے کہا ہم ایک ضروری کام سے جنگل جا رہے ہیں۔ کُچھ جڑی بوٹیاں لینی ہیں۔ ہماری واپسی تک دو سیاہ مرغ منگوا رکھنا۔ ہمیں اُن کی بھی ضرورت ہو گی۔ دونوں مُرغ بالکل سیاہ ہوں۔ اُن پر کہیں بھی سفید

نشان نہ ہو۔"

"آپ فکر نہ کریں مہاراج۔ آپ نے میرے بیٹے کی جان بچائی ہے۔ آپ کے لیے تو جان بھی حاضر ہے۔"

سارنگ بابا مُجھے ساتھ لے کر جنگل کی طرف چل دیے۔ جنگل خاصا گھنا تھا لیکن سارنگ بابا اُس جنگل کے چپّے چپّے سے یُوں واقف معلوم ہوتے تھے جیسے ایک کسان اپنے کھیت کے چپّے چپّے سے واقف ہوتا ہے۔ دوپہر تک وہ جنگل سے مختلف جڑی بوٹیاں اکٹھی کرتے رہے۔ جب دوپہر ہونے کو آئی تو اُنہوں نے ایک نظر جڑی بوٹیوں کو دیکھا، پھر اطمینان بھرے انداز میں کہنے لگے۔

"یہ کام تو ہو گیا بیٹے۔ آؤ، اب واپس چلیں؟"

ان الفاظ کے سوا سارنگ بابا نے صُبح سے اب تک مُجھ سے کُچھ نہیں کہا تھا اور میرا ذہن بھی اگرچہ رات کے واقعہ کے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن اپنے دِل کی بات زبان پر لانے کی ہمّت نہ ہو رہی تھی۔

حویلی میں واپس آ کر سارنگ بابا نے تمام جڑی بوٹیوں کو گھوٹا۔ مکھیا نے دو سیاہ مرغ پہلے ہی منگوا رکھے تھے۔ بابا نے دونوں کو ذبح کر کے اُن کا خون ایک پیالے میں جمع کیا اس خون کو جڑی بوٹیوں کے ساتھ شامل کر کے پھر گھوٹا اور پھر اپنے پاس سے کوئی سفوف اس میں شامل کیا جو دیکھنے میں کسی چیز کی راکھ معلوم ہوتا تھا۔ یہ سب چیزیں مل کر ایک گاڑھی سی لئی بن گئی جس سے عجیب قسم کی بُو آ رہی تھی۔

دوا تیّار ہو گئی تو بابا پیالہ ہاتھ میں لیے اُٹھ کھڑے ہوئے اور مُجھ سے کہنے لگے۔ ”انوشا بیٹے آؤ چلیں۔“ اور میں خاموشی سے اُن کے ساتھ ہو لیا۔ کُچھ دیر بعد ہم دریا کے کنارے پہنچ گئے۔ یہ وہی دریا تھا جسے میں نے کل رات دیکھا تھا۔ دِن کے اجالے میں بھی یہ ویسا ہی نظر آ رہا تھا۔ دریا کی طرف دیکھتے ہوئے میرا ذہن اب بھی یہی سوچ رہا تھا کہ کل رات کا ماجرا خواب تھا یا حقیقت؟

سارنگ بابا نے میرے کپڑے اُتروا دیے، مُنہ سورج کی طرف کر دیا اور جسم پر اس دوا کا گاڑھا گاڑھا لیپ کرنے لگے۔ جب میرے تمام بدِن پر دوا کا لیپ ہو چکا

تو وہ کہنے لگے۔

”اب ذرا اسے خُشک ہو جانے دو۔ اس کے بعد دریا میں نہالینا۔ پھر ایک ناگ کیا، ایسے ہزاروں ناگ بھی ہوں تو اُن کی پھُنکار کی گرمی تم پر اثر نہیں کرے گی۔ تمہیں معلوم ہے اس کی پھُنکار میں اتنی گرمی ہوتی ہے کہ پتھّر پر پڑے تو جل کر راکھ ہو جائے۔“

سارنگ بابا کے ان الفاظ سے مُجھے معلوم ہوا کہ رات میں نے جو کُچھ دیکھا وہ خواب نہیں حقیقت تھی۔ سارنگ بابا نے واقعی اس ناگ سے اپنی زبان پر ڈسوایا تھا اور اس طرح اس کا زہر اپنے جسم میں داخل کر تھا۔ اُنہیں تو کُچھ نہیں ہوا تھا لیکن میں اس کی چنگھاڑ کی گرمی سے ہی بے ہوش ہو گیا تھا۔ اور اب سارنگ بابا میرے جسم کو ایسا بنانے لگے تھے کہ اس پر ایک ناگ کیا، ایسے ہزاروں ناگوں کی پھُنکار کا بھی اثر نہ ہو۔ میرا دِل سارنگ بابا کے لیے عقیدت اور احترام کے جذبات سے بھر گیا۔

”اب ذرا دوڑ بھاگ کر اِسے جلدی سے خشک کر لو۔“ سارنگ بابا نے کہا۔

میں دریا کے کنارے دوڑنے لگا تا کہ دوا کا لیپ جلدی خشک ہو جائے۔ جب سارنگ بابا نے تسلّی کر لی کہ لیپ بالکل خشک ہو گیا ہے تو اُنہوں نے کہا۔

”اب دریا میں اُتر جاؤ۔ تیرنے کی کوشش بالکل نہ کرنا۔ بس پیٹھ کے بل پڑے رہنا۔“

جیسے ہی میں نے دریا میں چھلانگ لگائی، مُجھے یوں لگا جیسے میں پانی میں نہیں، آگ کے دہکتے ہوئے الاؤ میں کُود گیا ہوں۔ سارا جسم انگاروں کی طرح جل اُٹھا۔ جی چاہا کہ واپس چھلانگ لگا کر کنارے پر پہنچ جاؤں لیکن سارنگ بابا کا حکم تھا اور وہ کنارے پر کھڑے دیکھ بھی رہے تھے۔ میں نے اپنے ہونٹ سختی کے ساتھ بھینچ لیے تا کہ مُنہ سے چیخ نہ نکلے اور پھر پانی کی سطح پر پیٹھ کے بل پڑے رہنے کی کوشش کرنے لگا۔

میرے سارے بدن میں سوئیاں سی چُبھ رہی تھیں۔ لیکن میں نے ہاتھ پاؤں کو

اپنے قابو میں رکھا اور پانی کی سطح پر پیٹھ کے بل پڑا رہا۔

میری حالت تو جو تھی سو تھی۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ میں نے دریا میں جس جگہ چھلانگ لگائی تھی، تیرنے کی کوشش نہ کرنے کے باوجود، اب تک اسی جگہ تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے میں بہتے ہوئے پانی میں نہیں کسی جوہڑ یا تالاب میں ہوں۔ شاید یہ سارنگ بابا کی توجّہ کا اثر تھا کیونکہ وہ کنارے پر کھڑے برابر مُجھ پر نظریں جمائے ہوئے تھے اور ساتھ ساتھ مُنہ میں کُچھ بُڑبُڑا بھی رہے تھے۔

آہستہ آہستہ گرمی کا احساس کم ہوتا گیا اور پھر بالکل ختم ہو گیا۔ اب مجھے یُوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کسی نرم اور آرام دہ بستر پر ہوں۔

جب ٹھیک ایک پہر دِن باقی رہ گیا تو سارنگ نے آواز دی۔ "انوشا بیٹے! شاباش! بہت اچھے ذرا اچھی طرح مَل کر اپنا بدن صاف کر لو اور پھر باہر آ جاؤ۔" سارنگ بابا کا یہ حکم سُنتے ہی میں نے پانی میں غوطہ لگایا اور خوب مَل مَل کر بدن صاف کیا۔ جسم سے اتنا میل اُترا کہ میں حیران رہ گیا۔ میرے جسم پر اتنا میل ہو سکتا ہے،

اس کا مُجھے گمان بھی نہ تھا۔

لیکن جب میں دریا سے نکل کر کنارے پر آیا، تب مُجھے پتا چلا کہ جسے میں اپنے جسم کا میل سمجھتا تھا وہ اصل میں میری کھال تھی۔ جس طرح سانپ اپنی پرانی کینچلی اُتار پھینکتا ہے اسی طرح سارنگ بابا نے میرے جسم کی پرانی کھال اپنی دوا کے ذریعے اُتار دی تھی اور اس کی جگہ اب نئی کھال آگئی تھی۔

سارنگ بابا نے مُجھے ایک اونچی سی جگہ پر اس طرح بٹھا دیا کہ سورج کے ڈوبنے تک اس کی کرنیں مُجھ پر پڑتی رہیں۔ سورج ڈوب گیا تو سارنگ بابا کے حکم پر میں نے دوبارہ اپنے کپڑے پہن لیے اور ہم واپس چل دیے۔

میرا خیال تھا کہ ہم بستی کی طرف واپس جائیں گے لیکن سارنگ بابا نے جنگل کا رُخ کیا۔ ہم جنگل کے اندر گھنے درختوں کے درمیان ایک کھلی جگہ پر جا کر رُک گئے۔ وہاں سارنگ بابا نے درختوں کے پتّوں کا بستر بنایا اور پھر مُجھ سے کہنے لگے۔

"انوشا بیٹے! اپنے کپڑے اُتار کر ان پتّوں پر لیٹ جاؤ۔ دیکھنا کیسے مزے کی نیند

آتی ہے۔ تمہارے بدن پر ان کا جو اثر ہو گا وہ الگ رہا۔ آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام۔"

میں نے اُسی وقت سارنگ بابا کے حکم کی تعمیل کی کپڑے اُتار کر ایک طرف ڈال دیے اور ان پتّوں پر لیٹ گیا۔ پتّوں کی خوشبو مانوس معلوم ہو رہی تھی۔۔۔ یہ بالکل ویسی ہی تھی جیسی اُس ناگ کے جسم سے آ رہی تھی جب میں رامُو کا پیغام دینے کے لیے سارنگ بابا سے ملنے کی خاطر وادی میں داخل ہوا تھا۔ اس وقت اس بُو نے مُجھے سارنگ بابا کے غار تک پہنچایا تھا اور اب اس کے اثر کی وجہ سے یہ ہوا کہ میں ان پتّوں پر لیٹتے ہی گہری نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

ٹھیک آدھی رات کے وقت سارنگ، بابا نے مُجھے جگا دیا۔ شاید وہ خود نہیں سوئے تھے اور میرے پاس بیٹھے تھے۔ ممکن ہے کوئی جاپ بھی کرتے رہے ہوں۔ میں آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھ بیٹھا تو وہ بولے۔

"چلو، وقت ہو گیا ہے۔" میں اُن کے ساتھ ہو لیا۔ کل کی طرح رات آج بھی

بالکل اندھیری تھی۔ صرف آسمان پر تاروں کی مدّھم مدّھم روشنی تھی اور اس کے باوجود سارنگ بابا کے قدیم یوں اُٹھ رہے تھے جیسے اُن کے لیے رات کی تاریکی اور دِن کے اُجالے میں کوئی فرق نہیں۔

تھوڑی دیر بعد ہم دریا کے کنارے جا پہنچے اور سارنگ بابا کے حکم پر میں نے بِین بجانی شروع کی پھر وہی کُچھ ہوا جو کل رات ہوا تھا۔ پانی میں یوں شپاشپ کی آوازیں آنے لگیں جیسے دریا میں بیسیوں سانپ پھِر رہے ہیں۔

اچانک سارنگ بابا نے میرے ہاتھ سے بِین جھپٹ لی اور خود بجانے لگے۔ کل رات کی طرح سارنگ بابا کی لَے کا جادُو بھی اُسی رنگ میں ظاہر ہو رہا تھا۔ دریا کے پانی کا کُچھ حصّہ دائرے کی صورت میں چمکنے لگا تھا اور یوں نظر آتا تھا جیسے اس دائرے میں ہزاروں سانپ جمع ہیں۔ پھر اُن میں سے ایک سانپ کا پھَن اُوپر کی طرف اُٹھا اور اُٹھتا ہی چلا گیا۔ کُچھ دیر بعد یہ پھن پانی کی سطح سے تین ہاتھ یُوں اُونچا ہو گیا جیسے پانی میں کوئی بانس گاڑ دیا گیا ہو۔ پھر وہ سانپ آہستہ آہستہ ہماری طرف بڑھنے لگا۔ اِس حالت میں بھی اُس کا پھَن پانی سے تین ہاتھ اُوپر اُٹھا ہوا

تھا۔ ذرا سی دیر بعد وہ ہمارے بالکل سامنے آ گیا۔ اُس کا پھَن سارنگ بابا کے چہرے کے قریب تھا اور میں بھی سارنگ بابا کے بالکل پاس ہی کھڑا تھا۔ سارنگ بابا بِین بجا رہے تھے اور سانپ کا پھَن بِین کی لَے پر آہستہ آہستہ ہل رہا تھا۔

اچانک سارنگ بابا نے بِین اپنے ہونٹوں سے ہٹا لی، اِس کے ساتھ ہی سانپ کا پھَن تیزی سے نیچے کی طرف آیا اور اُس کی زبان بجلی کے کونڈے کی طرح لپکی، لیکن کل رات کی طرح سارنگ بابا نے اُس سے اپنی زبان کو نہیں ڈسوایا بلکہ وہ کُچھ کیا جس کا مُجھے گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔

بِین ہونٹوں سے ہٹاتے ہی سارنگ بابا تیزی سے پیچھے ہٹ گئے۔ سانپ کا پھَن جو اپنی جھوک میں آگے کو جھُک گیا تھا، میرے بائیں ہاتھ سے ٹکرایا اور میں نے اُسے اپنے دونوں ہاتھوں کی گرفت میں لے لیا۔ سانپ نے تڑپ کر اپنا باقی دھڑ زمین سے نکالا اور ایک زور کی پھُنکار مار کر میرے جسم کو اپنے شکنجے میں کسنے کی کوشش کرنے لگا۔ ”شاباش بیٹے!“ سارنگ بابا نے خوشی سے نعرہ لگایا۔ ”اب اِسے چھوڑنا نہیں۔ اِس کی گردن مضبوطی سے پکڑے رکھو اور ایک نیا تماشا

دیکھو!"

یہ کہہ کر سارنگ بابا نے پھر بین بجانی شروع کی۔ بین کی آواز پر سانپ کا تڑپنا پھڑکنا قُدرتی بات تھی۔ لیکن میں نے اُس کی گردن کو دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا اور اُس نے اوپر سے نیچے تک میرے بدن کو جکڑا ہوا تھا۔

سارنگ بابا برابر بین بجا رہے تھے اور سانپ ایک طرف تو اپنی گردن چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا اور دوسری طرف اپنے جسم کے بل میرے بدن کے گرد اِس طرح سخت کرتا جا رہا تھا کہ مجھے اپنی ہڈّیاں چٹخنی محسوس ہو رہی تھیں۔ لیکن نہ جانے مُجھ میں اُس وقت اتنی طاقت کہاں سے آگئی تھی کہ میں نے اُس کی گردن پر اپنی گرفت ڈھیلی نہ ہونے دی۔

یہ حالت دیر تک جاری نہیں رہ سکتی تھی۔ آخر سانپ پہلے تو ادھ مُوا سا ہوا اور پھر اُس کی جان جیسے بالکل ہی نکل گئی۔ سارنگ بابا بین بجاتے ہوئے میری اور ناگ

کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جیسے ہی سانپ بے حرکت ہوا، وہ بین ہونٹوں سے ہٹا کر سیدھے میری طرف بڑھے اور میرا ماتھا چومتے ہوئے بولے:

"شاباش بیٹے! تم نے میدان مار لیا ہے۔ وہ کام کیا ہے جو بڑے بڑے سنیاسی ساری عمر بھی نہ کر پاتے۔"

اُنہوں نے سانپ کی گردن سے میرے ہاتھ ہٹائے اور پھر میرے جسم کو سانپ کی گرفت سے آزاد کیا۔ جسم سانپ کی گرفت سے آزاد ہوا تو میں اپنی جگہ سے ذرا پیچھے ہٹا لیکن ابھی ایک قدم ہی اٹھایا تھا کہ اَدھ مُوا سا ہو کر زمین پر گر پڑا۔

چودہ ہاتھ لمبا ناگ

ہوش آیا تو میں نے آنکھیں کھول کر اپنے اِرد گرد دیکھا۔ میں وہیں، دریا کے کنارے پر پڑا تھا۔ سارنگ بابا مُسکراتے ہوئے میری طرف دیکھ رہے تھے اور ہم دونوں سے ذرا پرے وہ ناگ پڑا تھا۔ دِن کا اجالا چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ سورج کی کرنوں سے ناگ کا سارا جسم چاندی کی طرح چمک رہا تھا۔ سارنگ بابا بولے!

"بہت آرام کر چُکے بیٹے۔ آؤ اب واپس چلیں۔"

میں نے ایک نظر ناگ پر ڈالی۔ دِن کے اُجالے میں اُس کو دیکھ کر میں حیران رہ

گیا۔ اس کی لمبائی آدمی کے چودہ ہاتھ سے کم نہیں تھی۔

"کتنا بڑا ناگ ہے۔" میں نے حیرت سے کہا۔

سارنگ بابا نے مُردہ ناگ اپنے کندھوں پر ڈال لیا اور کہنے لگے۔

"یہ لمبائی ہی میں نہیں، قیمت میں بھی بہت بڑا ہے۔ کہتے ہیں مراہا تھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔ لیکن یہ ناگ تو کئی ہاتھیوں سے بھی قیمتی ہے۔ ناگ نہیں سونا ہے، نِرا سونا!"

میں خاموشی سے ان کے ساتھ چلنے لگا۔ راستے میں سارنگ بابا نے اس ناگ کے بارے میں مُجھے کُچھ اور باتیں بتائیں۔ یہ باتیں اِتنی حیران کر دینے والی تھیں کہ ناقابلِ یقین معلوم ہوتی تھیں۔ وہ کہہ رہے تھے۔

"یہ بہت خوف ناک ناگ ہے اور بہت نایاب بھی۔ اِسے میں نے یا تو کوہ شوالک میں شِیل شرنگن کی پہاڑی پر دیکھا تھا جہاں میرے گُرو ناگیش مہاراج رہتے تھے یا پھر یہاں دیکھا ہے۔ اِس کی پھُنکار میں ایسی گرمی ہوتی ہے کہ اِس کے مُنہ

سے شعلے نکلتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ اس کی اِس خوف ناک پھُنکار کی وجہ سے بڑے بڑے سنیاسیوں کو اِس کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ ہم اس سے پہلے بھی کئی بار اِس کا زہر اپنی زبان پر لے چکے ہیں، لیکن اب سے پہلے اِس کو اپنے قابو میں کرنے کی کوئی صورت نہیں بن سکی تھی۔"

اتنا کہہ کر سارنگ بابا ذرا رُکے۔ پھر کہنے لگے۔

"مکھیا کے نوجوان بیٹے کو دیکھ کر ہی ہم جان گئے تھے کہ اُسے اِس ناگ نے ڈسا ہے۔ اِس کا علاج ہمارے لیے کُچھ مُشکل نہ تھا۔ اصل مُشکل اور تھی۔ اِس ناگ کو قابو میں کرنے کے لیے ایک ساتھی کی ضرورت تھی۔ تکشک مہاراج کی مہربانی سے مُجھے تم جیسا لڑکا مل گیا تھا، لیکن دیکھنا یہ تھا کہ تُم اُس کی پھُنکار کی گرمی برداشت کر سکتے ہو یا نہیں۔ اسی لیے پہلی رات میں تمہیں اپنے ساتھ لے گیا تھا اور جب میں نے یہ دیکھا کہ تم اِس ناگ کی پھُنکار کو برداشت نہیں کر سکے تو میں نے دوا کے ذریعے تمہارے جسم کی کھال ہی سانپ کی کینچلی کی طرح بدل ڈالی تاکہ تُم اِس ناگ کی پھُنکار اور اِس کے وجود کی گرمی کو سہ سکو۔ اگر ہم نے

تمہارے بدِن کی کھال تبدیل نہ کر دی ہوتی تو اِس ناک کے بدن کی گرمی سے تمہارا سارا بدن جل کر کوئلہ ہو جاتا۔ ہماری ترکیب اپنی جگہ ہے لیکن تُم نے جو حوصلہ دِکھایا ہے اُس کا بھی جواب نہیں۔ تُم نہ ہوتے تو یہ ناگ ہاتھ نہیں آ سکتا تھا۔ یہ مُردہ ہو کر بھی سونے سے زیادہ قیمتی ہے۔"

"اب آپ اِس کا کیا کریں گے بابا؟" میں نے پوچھا۔

"یہ تمہیں جلد ہی معلوم ہو جائے گا۔" سارنگ بابا نے کہا۔ تھوڑی دیر بعد ہم بستی میں داخل ہوئے۔ بستی کا مکھیا اور دوسرے لوگ ہمارے یوں غائب رہنے سے خاصے فکر مند تھے۔ لیکن جب اُنہوں نے سارنگ بابا کو ایک بھاری بھر کم ناگ کندھوں پر اُٹھائے دیکھا تو اُن کی حیرانی تو دور ہو گئی لیکن دِلچسپی کُچھ اور بڑھ گئی۔ وہ اب دیکھنا چاہتے تھے کہ سارنگ بابا اِس مرے ہوئے ناگ کا کیا کرتے ہیں۔

سارنگ بابا نے لوگوں کو زیادہ انتظار نہیں کرایا۔ فوراً ایک کوری ہانڈی منگوائی۔

اُس کی تہہ میں ایک دواڈالی۔ پھر مرے ہوئے ناگ کو اُس کے اندر بند کیا۔ اُس کے اوپر پھر ایک اور دوا چھڑکی۔ پھر ہانڈی پر ڈھکنا رکھ کر اُس کے اوپر چکنی مٹّی کا دو دو اُنگل موٹا لیپ کر دیا۔ اِس کے بعد اُنہوں نے ہانڈی دُھوپ میں رکھ دی تاکہ مٹّی کا لیپ خشک ہو جائے۔

اس کے بعد انہوں نے وہ تنور گرم کرنے کا حکم دیا جو حویلی کے ایک کونے میں بنا ہوا تھا۔ تندور میں آگ جلا دی گئی جو دو پہر تک جلتی رہی۔ تنور سخت گرم ہو گیا تھا اور ہانڈی کا لیپ بھی خشک ہو چکا تھا۔ سارنگ بابا نے نہایت اطمینان سے ہانڈی اُٹھا کر دیکھتے ہوئے تنور کے اندر رکھ دی۔ پھر اُنہوں نے تنور کا مُنہ بند کر دیا اور بولے:

"اب کوئی شخص اِسے نہ چھیڑے۔ ہم یہ ہانڈی کل صُبح نکال لیں گے۔"

اس اس کے بعد سارنگ بابا مُجھے ساتھ لے کر حویلی کے الگ تھلگ حصّے میں آ گئے، جہاں مکھیا کی طرف سے ہمارے ٹھہرنے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ اور وہاں

آتے ہی میں نے ایک سوال جڑ دیا۔

"بابا جی! آپ نے صُبح کوہ شوالک اور شیل شرنگن کی پہاڑی کا ذکر کیا تھا۔ یہ کہاں ہیں اور آپ نے ناگیش مہاراج کا بھی نام لیا تھا۔ کیا آپ مُجھے اِن کے بارے میں کُچھ اور نہیں بتائیں گے؟"

سارنگ بابا ہنس کر بولے۔ "شوالک وہ پہاڑ ہے بیٹے، جہاں دیوتا رہتے ہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے تو کسی دیوتا کو نہیں دیکھا لیکن میرے گرو ناگیش مہاراج نے جو کوہ شوالک کے دامن میں ایک پہاڑی شیل شرنگن پر رہتے تھے، ایک بار مُجھے ایک جانور دِکھایا تھا جو آدھا انسان تھا اور آدھا پرندہ تھا۔ ناگیش مہاراج کا کہنا تھا کہ یہ دیوتاؤں کی سواری کا جانور ہے اور اسے گُرو کہتے ہیں۔"

"کیا آپ نے بھی اُس جانور کی سواری کی ہے بابا جی؟"

سارنگ بابا پھر ہنس دیے۔ "کیا مُورکھوں کی سی باتیں کرتے ہر انوشا بیٹے! میں کہاں کا دیوتا تھا جو اُس جانور کی سواری کرتا۔ میں تو برابر پچیس سال اپنے گرو کی

خدمت کرتا رہا ہوں تا کہ اُن سے کُچھ حاصل کر سکوں؟"

"پھر آپ نے اُن سے کیا حاصل کیا باباجی؟"

"جو میرے نصیب میں تھا بیٹے۔ وہ عِلم کا سمندر تھے۔ مُردوں کو زندہ کرنا جانتے تھے، سال ہا سال بغیر کھائے پیئے رہ سکتے تھے۔ انسان، حیوان، چرند، پرند جس کی شکل چاہتے، اختیار کر سکتے تھے۔ اپنی روح دوسرے جسم میں لے جا سکتے تھے، ہوا میں اُڑ سکتے تھے، سمندر کی تہہ میں جا سکتے تھے، پاتال کی خبر لا سکتے تھے۔ وہ وقت کے غُلام نہیں تھے، وقت اُن کا غلام تھا۔ آنے والے دِنوں کی باتیں اُن کے لیے یُوں تھیں جیسے اُن کی نظروں کے سامنے ہو رہی ہیں۔ غرض میں کیا کہوں بیٹے کہ اُن کے پاس کیا کُچھ نہیں تھا۔ وہ بہت کرنی والے تھے۔ اس وقت میری خواہش یہ تھی کہ وہ مُجھے مُردوں کو زندہ کرنے کا عِلم سکھا دیں۔ میں نے اُن کی ٹہل سیوا میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ لیکن اُنہوں نے یہ عِلم مُجھے نہیں سکھایا۔ اُن کا کہنا تھا کہ یہ عِلم بہت خطرناک ہے۔ نقصان زیادہ ہے۔ اِس سے قُدرت کے کاموں میں گڑبڑ پڑتی ہے اور اِس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوتا اور اُن کی یہ بات صحیح بھی

تھی۔ مجھے اس کا بڑا تلخ تجربہ ہے۔"

"وہ کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ ایسے کہ جن دِنوں میں اُن کی خدمت میں لگا ہوا تھا، ان دِنوں قریب ہی کُچھ شریر لوگ ایسے آ گئے جو ناگیش مہاراج کے چاپ میں گڑبڑ ڈالنے کی کوشش کرتے تھے۔ میں نے ناگیش مہاراج کو خوش کرنے کی خاطر اُن لوگوں سے کئی لڑائیاں لڑیں اور کئی بار اُنہیں مار بھگایا۔ لیکن وہ ہر بار نہ جانے کیسے پہلے سے زیادہ تعداد میں آ جاتے تھے اور پھر دنگا فساد کرنے لگتے تھے۔ آخر ایک مُقابلے میں اُنہوں نے مُجھے جان سے مار ڈالا اور میری لاش کو جلا کر اُس کی راکھ پانی میں گھولی اور اُسے ناگیش مہاراج کے پالتو ہرن کو پلا دیا۔"

"پھر کیا ہوا؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"پھر یہ ہوا کہ ناگیش مہاراج نے اپنے عِلم کے زور معلوم کر لیا کہ میں اُن کے پالتو ہرن کے پیٹ میں ہوں۔ اُنہوں نے منتر پڑھا تو میں ہرن کے پیٹ میں سے زندہ

ہو کر بول پڑا۔ ناگیش مہاراج نے ہرن کا پیٹ چاک کر کے مُجھے باہر نکالا اور کُچھ پڑھ کر مُردہ ہرن کو اُن لوگوں کی طرف پھینک دیا۔ وہ لوگ تو منتر کے اثر سے وہاں سے ہمیشہ کے لیے غائب ہو گئے لیکن ناگیش مہاراج کو اپنے پالتو ہرن کی جدائی کا جو دُکھ ہوا وہ میں بیان نہیں کر سکتا اور اُس دِن کے بعد میں نے پھر اُن سے مردوں کو زندہ کرنے کا عِلم سیکھنے کی خواہش ظاہر نہیں کی۔"

"یہ تو بڑا ہی عجیب واقعہ ہے۔" میں نے کہا۔ "یقین نہیں آتا کہ ایسا ہوا ہو گا۔ ایک آدمی کا مر جانا، پھر جل کر راکھ ہو جانا اور پھر اس راکھ کا ہرن کے پیٹ میں زندہ ہو جانا، کمال ہے!"

"یہ کمال میرا نہیں، بیٹے، ناگیش مہاراج کا تھا اور وہ ایسے ایک نہیں سینکڑوں کمال جانتے تھے۔"

سارنگ بابا نے یہ کہہ کر ایک آہ بھری اور کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اُن دِنوں کی یاد میں کھو گئے ہیں جو اُنہوں نے اپنے گرو ناگیش

مہاراج کے قدموں میں گزارے تھے۔ میں سارنگ بابا سے اور بہت کُچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن اُنہیں یوں خاموش اور اُداس دیکھ کر ہمّت نہ پڑی۔

خاصی دیر تک خاموش رہنے کے بعد وہ خود بھی کہنے لگے۔ "آہ کیا دِن تھے وہ بھی۔ یوں لگتا ہے جیسے ایک سپنا تھا۔ شوالک کے کالے کالے پہاڑ، شیل شرنگن کی پُراسرار پہاڑی اور ناگیسن مہاراج کے لمبے لمبے جاپ۔"

اتنے میں حویلی کے صحن میں ایک عورت کی گھبرائی ہوئی آواز گونجی۔ "بابا جی! کہاں ہیں بابا جی؟"

اور دوسرے ہی لمحے وہ عورت سارنگ بابا کے قدموں پر آگری اور چیختے ہوئے کہنے لگی "جلدی کُچھ کے مہاراج! ایک ناگ میری گائے کے تھنوں سے چمٹا ہوا ہے۔ جلدی چلیے۔"

سارنگ بابا فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے اور میرا بازو تھامتے ہوئے بولے۔ "آؤ بیٹے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کی طرف سے یہ سب کُچھ تمہارے لیے ہو رہا ہے۔

آؤ!“

یوحاناگ اور گائے

سارنگ بابا مُجھے ساتھ لے کر اُس عورت کے گھر پہنچے۔ وہاں بستی کے لوگوں کا میلا لگ چُکا تھا۔ گائے اُس عورت کے گھر کے صحن کے ایک کونے میں بندھی تھی۔ ایک ناگ، اُس کے تھنوں سے چمٹا ہوا تھا اور گائے کسی بُت کی طرح چُپ چاپ اور بے حرکت کھڑی تھی۔

سارنگ بابا آگے بڑھے اور لوگوں کو ایک طرف ہٹا کر گائے سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑے ہو گئے۔ اُنہوں نے اشارے سے مُجھے بِین بجانے کا حکم دیا۔ میں نے بین بجانی شروع کی۔ اتّفاق ہے یہ لَے وہی تھی جو میں شیش ناگ کے مندر

میں ناگ پنچمی کے تہوار کے موقع پر بجایا کرتا تھا۔

بِین سُن کر یکایک سارنگ بابا کے چہرے پر غصّے کے اثرات ظاہر ہوئے اور وہ بولے "ارے مُورکھ، اس کے کا یہ کون سا موقع ہے؟"

اُنہوں نے بِین میرے مُنہ سے جھپٹ کر خود بجانی شروع کر دی۔ یہ ایک اور ہی لَے تھی۔ اس کے فضا میں بُلند ہوتے ہی گائے نے جھرجھری سی لی اور سانپ کے جسم میں بھی حرکت پیدا ہوئی۔ سارنگ، بابا نے تھوڑی دیر بِین بجائی ہو گی کہ سانپ، گائے کے تھنوں سے علیٰحدہ ہو کہ زمین پر گر گیا۔ گرتے ہی اُس نے اپنا پھَن اُٹھایا اور اپنی گول گول آنکھیں گھما کہ اِرد گرد دیکھا اور پھر وہیں سے مینڈک کی طرح سارنگ بابا کی طرف چھلانگ لگائی۔

سارنگ بابا کو اِس کا پہلے سے اندازہ تھا اور میں بھی پوری طرح چوکس تھا۔ جیسے ہی سانپ نے سارنگ بابا کی طرف چھلانگ لگائی، وہ اپنی جگہ سے اُچھلے اور گائے کے تھنوں کے پاس پہنچ گئے۔ ساتھ ہی میں نے بھی چھلانگ لگائی اور سانپ کے

زمین پر آنے سے پہلے ہی اُس کی گردن کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

"شاباش بیٹے!" سارنگ بابا نے خوشی سے نعرہ لگایا اور پھر اُنہوں نے گائے کے ایک تھن سے مُنہ لگا دیا۔ بستی کے لوگ اِرد گرد کھڑے حیرانی سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ اُن کی زبانیں گنگ تھیں۔ کبھی وہ سارنگ بابا کی طرف دیکھتے تھے اور کبھی اُس سانپ کو دیکھتے تھے جس کی گردن میری گرفت میں تھی اور جو اِس گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ کُچھ دیر بعد سارنگ بابا نے گائے کے تھَن سے مُنہ ہٹایا اور میری طرف آئے۔ اُنہوں نے ہاتھ بڑھا کر سانپ کو مُجھ سے لے لیا اور بولے:

"اب تمہاری باری ہے۔ جتنا دُودھ پی سکتے ہو، پی جاؤ۔ اور لوگوں کے لیے یہ زہر ہے، لیکن تمہارے لیے امرت۔ اور یہ ایسا امرت ہے جو کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ میں نے غَلَط نہیں کہا تھا کہ قدرت تُم پر بہت مہربان معلوم ہوتی ہے۔ چلو، دیر نہ کرو۔"

اُن کے اشارے پر میں نے آگے بڑھ کر گائے کے تھَن سے مُنہ لگا دیا۔ گائے کے دُودھ کا پہلا قطرہ حلق میں پہنچتے ہی میرے جسم میں آگ سی لگ گئی۔ لیکن جیسے جیسے گائے کا دُودھ میرے جسم میں پہنچتا گیا، یہ آگ بھڑکنے کے بجائے ٹھنڈی ہوتی گئی۔ وہ دُودھ جس کے پہلے قطرے نے میرے جسم میں آگ لگا دی تھی، اب مجھے انتہائی مزے دار معلوم ہو رہا تھا۔

ایک تھَن خالی ہونے کے بعد میں نے دوسرے کو مُنہ لگا لیا اور اس کے بعد تیسرے کو۔ میں جب مُنہ پونچھتے ہوئے اُٹھا تو گائے کے چاروں تھَن دُودھ سے خالی ہو چکے تھے اور میں ایک عجیب سا سُرور محسوس کر رہا تھا۔

میں نے سارنگ بابا کی طرف دیکھا۔ وہ سانپ کو پٹاری میں بند کر چکے تھے اور گائے کی مالک عورت سے کہہ رہے تھے

"لو بہن، سنبھالو اپنی گائے کو۔ یہ ناگ ہم اپنے ساتھ لیے جاتے ہیں۔"

پھر سارنگ بابا نے مُجھے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا اور ہم بستی کے لوگوں کو حیرت

میں ڈوبا چھوڑ کر واپس مگھیا کی حویلی میں آ گئے۔ حویلی میں آتے ہی سارنگ بابا نے مُجھے ملامت کرتے ہوئے کہا۔

"یہ تمہیں کیا ہو گیا تھا جو تم نے ناگ پنچمی والی دُھن بجانا شروع کر دی تھی؟ تمہیں سانپ کو دُودھ تھوڑی پلانا تھا۔ ہم اُسے دودھ پلانے نہیں، اُس کا دُودھ چھُڑانے گئے تھے۔"

"غَلَطی ہو گئی بابا۔" میں نے کہا۔ "سچ پُوچھیں تو مُجھے اس ایک آدھ دُھن کے سوا اور آتا ہی کیا ہے۔ آپ سے پہلے مجھے کوئی اُستاد بھی تو نہیں مِلا۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو؟" سارنگ بابا بولے۔ "ہم تمہیں صحیح معنوں میں بِین بجانا سکھائیں گے۔ ہر ناگ کو مَست کرنے کے لیے ایک الگ دُھن ہوتی ہے۔ ناگوں کی ہزاروں قسمیں ہیں اور اِسی طرح بِین کی ہزاروں دُھنیں ہیں۔ آدمی ساری عمر کھپا دے تو بھی تمام دُھنیں نہیں سیکھ سکتا۔ لیکن فکر نہ کرو، ہم تمہیں تمام نہیں تو بڑی بڑی دُھنیں سکھائیں گے اور اِس کے ساتھ ہی مہاتالی بھی؟"

”مہاتالی!“میں نے حیران ہو کر کہا۔ ”وہ کیا ہے بابا؟“

”وہ بھی ایک دُھن ہے جس سے ناگوں کی اکثر قسمیں مست ہو جاتی ہیں۔ یہ دُھن خاصی مُشکل ہے اور میرے گرو مہاراج کہا کرتے تھے کہ جسے مہاتالی آتی ہے، وہ سانپوں کا پورا نہیں تو آدھا بادشاہ ضرور ہو جاتا ہے۔“

”کیا یہ وہی دُھن تھی بابا جو آپ نے اُس ناگ کو مست کرنے کے لیے بجائی تھی؟“میں نے بابا کے پاس رکھی ہوئی پٹاری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں بیٹے۔ وہ مہاتالی نہیں تھی۔ وہ ایک اور دُھن تھی، جو اِس قسم کے ناگ کے لیے ہوتی ہے۔ تمھیں شاید معلوم نہیں کہ یہ ناگ کی وہ قسم ہے جسے یُوحا کہا جاتا ہے۔“

”یُوحا!“میں نے دِلچسپی سے کہا۔ ”وہ کیسا ناگ ہوتا ہے؟“

”یہ ناگ ایک خاص عُمر کو پہنچ کر اِس قابل ہو جاتا ہے کہ جو شکل چاہے اختیار کر لے۔ بعض کہتے ہیں کہ عُمر کی یہ حد سو سال ہے اور بعض کہتے ہیں کہ ہزار سال۔

ٹھیک سے تو کسی کو معلوم نہیں، لیکن اتنا ضرور معلوم ہے ایسے ناگ عام طور پر انسان کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ جب جی چاہا ناگ سے آدمی بن گئے اور جب جی چاہا آدمی سے پھر ناگ بن گئے۔ لیکن اِس کے لیے اُن ناگوں کو مختلف مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے اور کئی شرطیں پوری کرنی پڑتی ہیں۔ عام طور پر سب سے پہلی شرط یہ ہوتی ہے کہ وہ ناگ اِس عُمر کو پہنچنے تک اِس حالت میں رہے کہ کسی آدمی کی نظر اُس پر نہ پڑے۔ بعض ناگوں کو تو اِس شرط کے پورے ہونے پر ہی کامیابی ہو جاتی ہے اور بعض کو اِس سے اگلی شرط پوری کرنے لیے سو گایوں کا دُودھ پینا پڑتا ہے۔"

"تو کیا یہ ناگ اِسی لیے گائے کا دُودھ پی رہا تھا؟" میں نے پوچھا

"معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔" سارنگ بابا بولے۔ "پتا نہیں یہ اِس سے پہلے کتنی گایوں کا دُودھ پی چکا ہو گا۔ عام طور پر ایسے ناگ رات کے اندھیرے میں اور دوسروں کی نظروں سے چھُپ کر ایسا کرتے ہیں۔ اِس لحاظ سے یہ ناگ خاصا احمق معلوم ہوتا ہے، جو دِن کے اُجالے میں گائے کے تھنوں سے چِمٹ گیا۔ پر

خیر، یہ ناگ احمق تھا یا نہیں، اِس کا ایک فائدہ ہم دونوں کو ہوا۔ ہمیں گائے کا ایسا دُودھ پینے کو مِل گیا جس میں اِس ناگ کا اثر آ گیا تھا۔ یہ اثر آگے چل کر اپنا رنگ دِکھائے گا۔ اور پھر وہ ناگ بھی ہمارے ہاتھ لگ گیا جو پہلی شرط پُوری ہونے کے مرحلے سے گُزر رہا تھا۔ تمہارا کل والا ناگ سونا ہے، تو یہ ناگ سونے کی کان۔"

"آپ اِس کا کیا کریں گے، بابا جی؟" میں نے پوچھا۔

"بہت کُچھ کر سکتے ہیں۔" سارنگ بابا نے کہا۔ "چلو ذرا ایک چکّر جنگل کا لگا آئیں۔ کُچھ اور جڑی بوٹیاں اکٹھی کرنی ہیں۔"

اور یہ کہہ کر سارنگ بابا مُجھے ساتھ لے کر جنگل کی طرف چل دیے۔ شام تک جنگل میں پھِرنے کے بعد انہوں نے کُچھ جڑی بوٹیاں اکٹھی کیں۔ یہ جڑی بوٹیاں اُن جڑی بوٹیوں سے بالکل مختلف تھیں، جو بابا نے میرے بدن پر لیپ کرنے کے لیے جمع کی تھیں۔ اِس کام سے فارغ ہو کر سارنگ بابا اور میں بستی کی طرف واپس ہوئے تو شام کے سائے گہرے ہو چکے تھے۔

حویلی میں واپس آنے کے بعد ہم رات کے کھانے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ وہی گائے والی عورت کھیر کا ایک بڑا سا تھال لے کر آئی۔

"باباجی، آپ نے میرے حال پر مہربانی کی ہے۔ میں غریب آپ کی اور تو کوئی سیوا نہیں کر سکتی، اُسی گائے کے دُودھ سے یہ کھیر بنا کر لائی ہوں۔ اِسے قبول کیجئے۔"

سارنگ بابا بولے۔ "اِس وقت تو ہم کھانا کھا چکے ہیں، بہن، بھُوک بالکل نہیں ہے۔ لیکن تمہارا دِل بھی توڑنا ٹھیک نہیں۔ یہ تھال یہیں چھوڑ جاؤ۔ صُبح آ کر لے جانا۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔" عورت نے کہا اور کھیر کا تھال ایک کونے میں رکھ کر چلی گئی۔

اُس رات ہم جلدی سو گئے اور سوئے بھی ایسے کہ سُدھ نہ رہی۔ شاید اُس دُودھ نے جس میں سارنگ بابا کے کہنے کے مطابق اُس ناگ کا اثر آ گیا تھا، ہم پہ غفلت

کی نیند طاری کر دی تھی۔

آدھی رات کے قریب اچانک میری آنکھ کھُل گئی۔

آس پاس کوئی آہٹ ہوئی تھی۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا اور اندھیرے میں دیکھنے اور سُننے کی کوشش کرنے لگا۔ ایک کونے میں سے ایسی آواز آرہی تھی جیسے کوئی بلّی دُودھ پی رہی ہو۔ میرا دھیان کھیر کے اُس تھال کی طرف گیا جو وہ عورت دے گئی تھی۔ اُس کے ساتھ ہی مجھے خیال آیا کہ شاید کھیر کی خُوشبو پا کر کوئی بلّی یہاں آ گئی ہے اور کھیر کے تھال پر ہاتھ صاف کر رہی ہے۔ میں نے یہ خیال کر کے اُس کونے کی طرف دیکھا جہاں سارنگ بابا نے کھیر کا تھال رکھوایا تھا۔ میں حیران رہ گیا۔ اُس کونے سے دو آنکھیں میری طرف گھور رہی تھیں۔ میں نے بلّی کا خیال کرتے ہوئے اُسے بھگانے کے لیے مُنہ سے آواز نکالنی چاہی لیکن کسی نے یوں سرگوشی میں "شش" کہا جیسے مُجھے خاموش ہونے کی تاکید کر رہا ہو۔ اس کے ساتھ ہی وہ آنکھیں ایک دم غائب ہو گئیں اور اُس کے کُچھ دیر بعد ہی میں بھی دوبارہ نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔ شاید یہ سارا کُچھ میں نے خواب میں ہی دیکھا

تھا۔

اِس کے بعد مُجھے جو نیند آئی، وہ بہت گہری تھی اور اِس نیند کا جادُو اُس وقت ٹوٹا جب دِن چڑھے سارنگ بابا نے مُجھے بستر میں ہی جھنجوڑ ڈالا،

"انوشا! انوشا! انوشا، بیٹے!"

میں آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھ بیٹھا اور بولا۔ "کیا بات ہے باباجی؟" ابھی سارنگ بابا نے میری بات کا کُچھ جواب نہ دیا تاکہ میں نے آنکھیں کھول کر سامنے نگاہ کی تو میری نظریں وہیں جم کر رہ گئیں۔ ناگ والی پٹاری کا ڈھکنا ایک طرف پڑا تھا اور پٹاری خالی نظر آ رہی تھی۔ دوسرے کونے میں کھیر کا تھال یوں صاف تھا جیسے اُس میں کھیر تھی ہی نہیں۔ میں ایک دم بستر سے نکلا اور آگے بڑھ کر پٹاری کو اُلٹ پلٹ کرنے لگا۔ لیکن اب اُس میں رکھا ہی کیا تھا۔ دوسرے کونے میں خالی تھال جیسے میرا مُنہ چڑھا رہا تھا۔

"یہ کیا ہو گیا، باباجی؟" میں نے مری ہوئی سی آواز میں کہا۔

سارنگ بابا کھوئی کھوئی سی نظروں سے اپنی خالی پٹاری کو دیکھتے رہے۔ پھر کہنے لگے:

"اس کھیر کے تھال نے ہماری ساری محنت پر پانی پھیر دیا ہے۔ وہ عورت تو بڑی خوش خوش ہمارے لیے کھیر بنا کر لائی تھی لیکن اِس کی کھیر نے ہماری کھیر کا دلیا کر دیا۔ غَلَطی ہم سے بھی ہوئی جو یہ کھیر کا تھال رکھ چھوڑا۔ کھا لیتے یا واپس کر دیتے، ہم اِس ناگ کو احمق بتا رہے تھے، لیکن احمق ہم خود نکلے اور وُہ ہمیں جُل دے گیا۔ معلوم نہیں وہ کس وقت یہاں سے نکلا ہے اور اِس وقت کہاں ہو گا؟ حیرانی کی بات تو یہ ہے کہ وہ پٹاری سے نکلا کیسے؟"

"پٹاری کا ڈھکنا مضبوطی۔ سے بند نہیں ہو گا۔" میں نے کہا۔

"ڈھکنا تو بند تھا، بیٹے۔" سارنگ بابا بولے۔ "پر ہاں یاد آیا۔ وہ عورت جب کھیر کا تھال رکھ کر مُڑی ہے تو اُس کے پاؤں کی ٹھوکر لگی تھی پٹاری کو۔ اُس وقت ہم نے اِس بات کا کُچھ خیال نہیں کیا۔ اِس ذرا سی چُوک کی کتنی بڑی سزا ملی ہے

ہمیں۔ ویسے اِس میں اُس عورت کی کوئی خطا نہیں۔ قصور سارا ہمارا اپنا ہے۔"

"رات میری آنکھ کھُلی تھی، باباجی۔" میں نے کہا۔ "اور اُس وقت مجھے یُوں لگا تھا جیسے کوئی بلّی کھیر کا تھال چاٹ رہی ہے۔ میں نے دو آنکھیں بھی اپنی طرف گھورتے دیکھی تھیں۔ ہو سکتا ہے جسے میں بلّی سمجھا تھا، وہ وہی ناگ ہو۔"

"ارے پگلے! تُم نے مُجھے جگایا کیوں نہیں؟"

"میرے لیے تو یہ سارا کُچھ ایک خواب کی طرح تھا۔ یہ تو اب محسوس ہوتا ہے کہ جو کُچھ میں نے دیکھا، وہ خواب نہیں، حقیقت تھی۔"

سارنگ بابا کُچھ دیر خاموش رہے۔ پھر افسوس بھرے لہجے میں کہنے لگے!

"شاید قدرت کو ہمارا لالچ پسند نہیں آیا۔ یہ گویا قُدرت کی طرف سے اِس بات کا اِشارہ ہے کہ یہاں سے جو کُچھ تمہارے ہاتھ لگا ہے، اُسی پر قناعت کرو اور آگے کی راہ لو۔۔۔ ٹھیک ہے، جو کُچھ یہاں سے ہمارے ہاتھ لگا ہے، ہم اُسی پہ تو قناعت کریں گے اور ابھی یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔"

یہ کہتے ہوئے سارنگ بابا تنور کی طرف گئے اور اُسے کھولا۔ تنور اب سرد ہو چکا تھا۔ اُنہوں نے اُس کے اندر سے وہ کوری ہانڈی نکالی جس میں مُردہ ناگ کو بند کیا تھا۔ پھر اُس بند ہانڈی کو اپنی جھولی میں ڈالا اور میرا ہاتھ تھام کر باہر کی طرف بڑھے۔ بستی والوں نے اُنہیں روکنے کی بہت کوشش کی لیکن سارنگ بابا سب کی التجاؤں کو ٹھکراتے ہوئے بستی سے چل دیے۔

سردار کی بیوی

ہم بستی سے روانہ ہوئے تو سارنگ بابا پھر ڈیڑھ پہر تک بالکل خاموش رہے۔ یوں لگتا تھا جیسے اُنہوں نے نہ بولنے کی قسم کھائی ہے، یا کُچھ کوئی جاپ شروع کر دیا ہے۔ اُن کا چہرہ اُترا ہوا تھا اور میں بھی کُچھ خاموش سا تھا۔ سارنگ بابا کی اُداسی نے مُجھے بھی اُداس کر دیا تھا۔

اِس اُداسی سے اُکتا کر میں نے بِین ہونٹوں سے لگائی اور بجانے ہی لگا تھا کہ بابا نے ہاتھ کے اِشارے سے مُجھے روک دیا۔ پھر کہنے گئے!

"ٹھہرو! میں تمہیں ایک نئی دُھن سِکھاتا ہوں۔"

اور یُوں یہ سفر میرے لیے بین کی نئی دُھنیں سیکھنے کا ذریعہ بن گیا۔ پورے چالیس دِن تک سارنگ بابا اور میں اِس حال میں سفر کرتے رہے کہ دِن بھر کے سفر میں وہ مُجھے نئی دُھنیں سکھاتے اور میں بین پر اُن کی مشق کرتا۔ اِن چالیس دِنوں کے سفر میں سارنگ بابا نے مُجھے ایک سو کے قریب نئی دُھنیں سِکھا دیا تھیں اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ کون سی دُھن کس قسم کے ناگ کے لیے ہے۔

اس حال میں سفر کرتے ہوئے اکتالیسویں دِن ہم ایک ایسی بستی میں پہنچے جہاں کا سردار سارنگ بابا کا پُرانا واقف تھا۔ اُس نے ہماری بڑی آؤ بھگت کی۔ ہمارے لیے خاص طور پر کھانے کا بندوبست کیا اور پھر ایک الگ تھلگ مکان میں ہمارے بستر لگوا دیے۔ صرف یہی نہیں، اپنے ایک آدمی کو بھی ہماری خدمت پر مقرّر کر دیا تاکہ ہمیں جس چیز کی ضرورت ہو فوراً مہیّا کر دی جائے۔

سارنگ بابا اور میں ایسی زندگی سے کوسوں دُور تھے۔ لیکن سارنگ بابا نے سردار کا دِل رکھنے کے خیال سے اس تکلّف کو قبول کر لیا۔ یوں بھی رات بھر کے لیے اِس تکلّف کو قبول کر لیتے میں کوئی حرج نہ تھا۔ سارنگ بابا نے جب مُجھے یہ بتایا تھا

کہ اِس بستی کا سردار اُن کا پرانا واقف ہے تو ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اس کے باوجود وہ اِس بستی میں رات بھر سے زیادہ نہیں ٹھہریں گے۔ لیکن انسان سوچتا کُچھ ہے اور ہوتا کُچھ ہے۔ آدھی رات کے قریب سردار نے ہمیں آکر اُٹھا دیا اور سارنگ بابا کے آگے ہاتھ جوڑتا ہوا بولا۔

"بابا جی! میں اِس وقت آپ کو ہرگز ہرگز تکلیف نہ دیتا، لیکن بات یہ ہے کہ میری گھر والی ایک عرصے سے بیمار چلی آرہی ہے اور اِس وقت اُس کی حالت سخت خراب ہے۔ مہربانی کیجیے اور چل کر ایک نظر اُسے دیکھ لیجیے۔"

سارنگ بابا نے جواب میں کُچھ نہیں کہا۔ خاموشی سے اُٹھے اور مُجھے ساتھ چلنے کا اشارہ کر کے سردار کے ساتھ ہو لیے۔

سردار کی حویلی کے اندرونی حصّے میں عورتوں کا جمگھٹا لگا ہوا تھا۔ یہ بستی کی عورتیں تھیں۔ آدھی رات کے وقت اتنی عورتوں کو جمع دیکھ کر مُجھے سخت حیرانی ہوئی۔ بستی کی عورتوں کو سردار کی بیوی کا کتنا خیال تھا۔ لیکن یہ تو مُجھے بعد میں معلوم ہوا

کہ یہ عورتیں دِن کے تیسرے پہر سے ہی سردار کے ہاں موجود تھیں۔

سارنگ بابا نے جاتے ہی سب عورتوں کو ایک طرف ہٹا دیا اور مریضہ کے بستر پر جھُک گئے۔ مریضہ پچیس تیس سال کی عورت تھی۔ اُس کے چہرے کو دیکھ کر صاف پتا چلتا تھا کہ وہ کبھی ایک خوب صورت عورت تھی۔ لیکن اِس وقت ہڈّیوں کا ڈھانچہ بن گئی تھی۔ وہ اگرچہ ہوش میں تھی لیکن کمزوری اِس قدر تھی کہ بات تک نہ کر سکتی تھی۔

یہ حالت تو اُس کی نہ جانے کب سے تھی لیکن جس بات سے گھبرا کر سردار آدھی رات کے وقت سارنگ بابا کو اُٹھا کے لایا تھا، وہ یہ تھی کہ مریضہ ذرا ذرا دیر کے بعد اپنے کلیجے کو یوں تھامتی تھی جیسے کوئی اندر ہی اندر اُس کو مسوس رہا ہو۔ اس کے ساتھ ہی اُس کی کمزوری بڑھتی جا رہی تھی۔

سارنگ بابا نے کُچھ دیر غور سے عورت کو دیکھا پھر وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور مُجھ سے کہنے لگے!

”انوشا بیٹے، تم نے پچھلے چالیس دِنوں میں جو سبق پڑھا ہے، اب اُس کے امتحان کا وقت آ گیا ہے۔ تمام دُھنیں تمہیں یاد ہیں نا؟“

”ہاں بابا جی۔“

”کوئی دُھن بھُول تو نہیں گئے ہو؟“

”نہیں، بابا جی۔“

”تو پھر بِین سنبھالو اور ایک ایک دُھن باری باری بجاتے جاؤ اور جب میں اشارہ کروں تو دُھن بدل دینا۔“

سارنگ بابا سے کہتے ہوئے عورت کے بستر کے پاس بیٹھ گئے اور اُنہوں نے اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیاں اُس کی نبض پر رکھ دیں۔ میں نے ان سے چند قدم پَرے ہٹ کر بِین سنبھالی اور ہونٹوں سے لگا کر وہ پہلی دُھن بجانے لگا جو سارنگ بابا نے مُجھے سکھائی تھی۔

ذرا دیر بعد ہی سارنگ بابا نے اِشارہ کیا تو میں نے وہ دُھن چھوڑ کر اگلی دُھن شروع کر دی۔ تھوڑی دیر بعد بابا نے پھر اشارہ کیا تو میں دوسری دُھن چھوڑ کر تیسری پر پہنچ گیا۔ پھر چوتھی، پانچویں، چھٹی، ساتویں، غرض سارنگ بابا اشارہ کرتے گئے اور میں ایک کے بعد دوسری دُھن بجاتا گیا۔

سارنگ بابا کے دائیں ہاتھ کی اُنگلیاں مریضہ کی نبض پر تھیں اور میری بِین میرے مُنہ میں۔ رات جا چکی تھی اور پُورب سے سورج کی سُرخ سُرخ کرنیں حویلی کے صحن میں پڑنے لگیں تھیں۔ میں اب تک ۹۷ دُھنیں بجا چکا تھا۔ اور ۹۸ ویں دُھن بجا رہا تھا۔

سارنگ بابا کے اِشارے پر میں نے ۹۸ ویں دُھن ختم کر کے وہ ۹۹ ویں دُھن شروع کی جو سارنگ بابا نے مُجھے سکھائی تھی۔ اِس دُھن کو بجاتے چند لمحے ہی ہوئے تھے کہ سارنگ بابا نے عجیب سے جوش سے کہا:

"شاباش، بیٹے! شاباش! یہی دُھن بجاتے جاؤ!"

اور میں پورے جوش سے وہی دُھن بجاتا چلا گیا۔ اُس دُھن سے مریضہ پر جو اثر پڑا وہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔ پہلے تو اُس کے جسم میں تناؤ پیدا ہوا۔ پھر وہ ایک زوردار چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی۔

چیخ کی آواز سُن کر سردار اور دوسری عورتیں مریضہ کی طرف لپکیں، لیکن سارنگ بابا نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روک دیا۔

میں اگرچہ پورے دھیان سے بین بجا رہا تھا مگر میری نگاہیں مریضہ کے چہرے پر جمی تھیں۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں لیکن مُنہ کسی اندھیرے غار کے بھیانک دروازے کی طرح کھُلا تھا اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔

میں خاصی دیر تک دُھن بجاتا رہا اور پھر دیکھنے والوں نے ایک انتہائی عجیب و غریب اور ناقابلِ یقین منظر دیکھا۔ مریضہ کے کھُلے مُنہ سے ایک سانپ کا سر باہر آیا۔ دیکھنے والوں کے مُنہ حیرانی اور خوف سے کھُلے کے کھُلے رہ گئے۔ سانپ اپنا سر اُوپر اٹھائے باہر نکلنا شروع ہوا۔ سارنگ بابا پہلے ہی سے اِس موقع کے

انتظار میں تھے۔ اُن کا بایاں ہاتھ تیزی سے آگے بڑھا اور اُنہوں نے سانپ کو گردن سے دبوچ کر ایک دم باہر کھینچ لیا۔ پھر جیسے وہ خوشی کا نعرہ مارتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور بولے!

"شاباش، بیٹے شاباش! آج تو تُم نے کمال کر دیا؟"

آدھی رات سے صُبح تک بِین بجاتے بجاتے میں تھک گیا تھا، لیکن سارنگ بابا کے یہ الفاظ سُن کر میری ساری تھکاوٹ جاتی رہی۔ میں نے بِین ہونٹوں سے ہٹا کر اُس سانپ کی طرف دیکھا جو سارنگ بابا کے ہاتھ میں تھا۔ یہ کوئی دو ہاتھ لمبا اور ایک ڈیڑھ اُنگل موٹا سانپ تھا۔ اُسے دیکھ کر میں حیران ہو رہا تھا۔ مُجھے کبھی خیال بھی نہیں آ سکتا تھا کہ کِسی انسان کے جسم میں بھی سانپ ہو سکتا ہے۔

عورتوں کی حیرانی اور خوف تو اپنی جگہ تھا ہی، خود سردار بھی سانپ کی طرف پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ یہ وہ سانپ تھا جسے سارنگ بابا نے اُس کی بیوی کے جسم سے باہر نکالا تھا لیکن یوں لگتا تھا جیسے اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا

ہے۔ بات ہی کُچھ ایسی تھی۔

سارنگ بابا سانپ ہاتھ میں لیے سردار کی طرف بڑھے اور اُس کے پاس جا کر کہنے لگے۔

"میرے دوست! یہی تمہاری بیوی کا اصل مرض تھا۔ یہ سانپ نہ جانے کیسے اِس کے جسم کے اندر چلا گیا اور جونک کی طرح اِس کے کلیجے سے چمٹا ہوا اِس کا خون چوس رہا تھا۔"

"اتنا بڑا سانپ!" سردار نے حیرت سے کہا۔ "مُجھے یقین نہیں آ رہا، مہاراج! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ کیسے ہو گیا؟"

سارنگ بابا مُسکراتے ہوئے بولے۔ "ذرا غور کرو تو تُم خود سمجھ جاؤ گے۔ شاید تمہاری بیوی نے کُچھ عرصہ پہلے کسی چشمے ندی یا تالاب سے ایسا پانی پی لیا ہو گا جو صاف نہیں تھا۔ شاید اِس پانی میں یہ سانپ ایک چھوٹے سے سنپولیے کی شکل میں موجود تھا۔ وہ پانی کے ساتھ ہی تمہاری بیوی کے جسم میں چلا گیا اور وہاں پل

پل کر اِتنا بڑا ہو گیا۔ میں نے دیکھتے ہی اندازہ کر لیا تھا کہ ایک سانپ جونک کی طرح تمہاری بیوی کے کلیجے سے چمٹا ہوا ہے۔ میں چاہتا تو اس کے جسم کے اندر ہی اِسے ختم کر سکتا تھا، لیکن میں اِسے زندہ باہر نکالنا چاہتا تھا۔ تم جانو، ہم جوگیوں کے لیے سانپ سے بڑھ کر قیمتی چیز کوئی نہیں ہوتی۔ ہمارے لیے یہ اندازہ لگانا مُشکل تھا کہ یہ کون سا سانپ ہے اور اِسے مست کرنے کے لیے کون سی دُھن کام دے گی، اِسی لیے انوشا بیٹے کو ایک نہ دو پوری ۹۹ دُھنیں بجانی پڑیں۔ تب کہیں جا کر یہ باہر نکلا۔ اب تمہاری بیوی ٹھیک ہے۔ آہستہ آہستہ بالکل تندرست ہو جائے گی۔"

سردار نے بے اختیار جھک کر سارنگ بابا کے پاؤں چھوئے اور کہا۔ "مہاراج! آپ نے مُردے کو زندہ کر دیا ہے۔ میری گھر والی کو اور خود مُجھے ایک زندگی بخش دی ہے۔ میں ساری عمر بھی آپ کی غلامی کروں تو بھی آپ کے احسان کا بدلہ نہیں اُتار سکتا۔" سارنگ بابا نے مُسکراتے ہوئے مریضہ کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھیں اگرچہ پہلے کی طرح ہی بند تھیں اور مُنہ کھُلا ہوا تھا، لیکن اُس کی

حالت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ نہایت آرام اور سکون کی نیند سو رہی تھی۔ آرام اور سکون کی یہ نیند اُسے ایک مدّت کے بعد نصیب ہوئی تھی۔ عورتیں اُس کی چارپائی کے اِرد گرد آ کھڑی ہوئی تھیں لیکن اُن کے چہرے پریشانی کی نہیں، اطمینان کی تصویر تھے۔

سارنگ بابا نے ایک کوری ہنڈیا منگوا کر سانپ کو اُس میں بند کیا۔ پھر مُجھ سے کہنے لگے۔

"انوشا بیٹے! آؤ، اب چلیں۔ مُجھ سے زیادہ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔"

اور پھر ہم سردار کے ہاں سے اُس مکان کی طرف چل دیے جہاں سردار نے ہمارے بستر لگوائے تھے۔ جاتے جاتے سارنگ بابا نے سردار کو یہ تاکید ضرور کر دی کہ مریضہ کو ایک ہفتے تک سوائے دُودھ کے اور کُچھ نہ دیا جائے۔

برگد کی جڑوں میں

سردار کے ہاں سے چلتے وقت میرا خیال تھا کہ ہم اپنے ٹھکانے پر پہنچتے ہی سیدھے اپنے اپنے بستر کا رُخ کریں گے اور اس طرح رات بھر کی تھکاوٹ اور بے آرامی کو ذرا دور کر کے پھر کسی اور طرف متوجّہ ہوں گے۔ لیکن سردار کی بیوی کے علاج میں ہمیں جو حیرت انگیز کامیابی ہوئی تھی، اس نے ہم پر ایک نشہ سا طاری کر دیا تھا۔ کامیابی کے جوش میں ہمیں اپنی تھکاوٹ کا احساس تک نہیں تھا۔

مکان پر پہنچتے ہی سارنگ بابا نے مُجھ سے کہا۔ ”انوشا بیٹے! مُجھے خوشی ہے کہ تمہاری محنت سے ہمارا نقصان کسی حد تک پورا ہو گیا ہے۔“

"میں آپ کی بات سمجھا نہیں بابا؟"

"ابھی سمجھاتا ہوں، بیٹے۔ یاد ہے ناوہ گائے والا ناگ جو ہمارے ہاتھ سے نِکل گیا تھا۔ اُس کے بعد میں نے تمہیں بِین کی سو نئی دُھنیں سکھائیں۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ تم یہ تمام دُھنیں نہ صرف یاد رکھو گے بلکہ اُنہیں نہایت مہارت سے بجاؤ گے بھی۔ آخر کیوں نہ ہو، تم وہ چیلے ہو جسے میں نے تکشک مہاراج کا جاپ کر کے حاصل کیا ہے اور یہ سب تمہاری محنت کا کرشمہ ہے کہ قدرت نے ہمیں اِس ناگ کے بدلے میں یہ سانپ عنایت کر دیا ہے، جو دُنیا میں اپنی قسم کا ایک ہی سانپ ہے۔"

"اپنی قسم کا ایک ہی سانپ!" میں نے حیرانی سے کہا۔

"ہاں بیٹے۔ اِس نسل کا سانپ ویسے ہی کم یاب ہے۔ لیکن اِس سے بھی بڑھ کر انوکھی بات یہ ہے کہ اِس سانپ کی پرورش انسان کے خون پر ہوئی ہے اور اِس طرح یہ دُنیا میں اپنی قسم کا واحد سانپ بن گیا ہے۔ عورت کا خون پی پی کر اِس

کے زہر اور اِس کے جسم میں ایک ایسی تاثیر پیدا ہو گئی ہے جو دُنیا کے کسی اور سانپ میں نہیں۔ یہ سانپ نہیں، اکسیر ہے اکسیر اور اب ہم اِس اکسیر کے کرشمے دُنیا کو دکھائیں گے۔"

یہ کہہ کر سارنگ بابا نے اپنے تھیلے سے وہ جڑی بوٹیاں نکالیں جو اُنہوں نے گائے والے ناگ کے لیے جنگل سے اکٹھی کی تھیں۔ یہ بوٹیاں اب خشک ہو چکی تھیں۔ سارنگ بابا نے اُنہیں کوٹ پیس کر سفوف کی طرح باریک کیا، پھر اپنے تھیلے میں سے کوئی دوا نکال کر ملائی۔ اِس کے بعد اُنہوں نے سانپ ہنڈیا سے نکالا اور اُس کا مُنہ کھول کر تھوڑا سا سفوف اُس میں ڈال دیا۔

جیسے ہی وہ سفوف سانپ کے حلق میں پہنچا، اُس کا سارا جسم ایک دم سُن ہو گیا۔ سارنگ بابا نے سانپ کو دوبارہ ہنڈیا میں رکھا، اُس پر کُچھ اور سفوف چھڑکا اور ہنڈیا کا ڈھکن مضبوطی سے بند کر کے اُس پر چکنی مٹّی کا لیپ کر دیا۔ لیپ کے خشک ہونے کے لیے اُنہوں نے ہنڈیا دھوپ میں رکھ دی اور پھر مُجھ سے کہنے لگے۔

”لو بیٹے! اب تم ذرا آرام کر لو۔ پچھلے پہر ہم باہر جائیں گے۔“

اتنے میں سردار کے ہاں سے ہمارے لیے کھانا آ گیا۔ کھانا کھا کر میں بستر پر لیٹا تو لیٹتے ہی نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

کوئی ڈیڑھ پہر دِن باقی تھا جب میری آنکھ کھُلی۔ سارنگ بابا مُجھ سے پہلے جاگ چکے تھے، یا شاید وہ سوئے ہی نہیں تھے اور برابر ہنڈیا کا پہرا دیتے رہے تھے کہ گائے والے ناگ کی پٹاری کی طرح اِس کے ساتھ بھی کوئی واردات نہ ہو جائے۔ میرے اُٹھتے ہی وہ مُسکراتے ہوئے قریب آئے اور بولے! ”بہت سو لیے، بیٹے۔ آؤ اب ذرا باہر ہو آئیں۔“

یہ کہتے ہوئے اُنہوں نے سانپ والی ہنڈیا بغل میں دبائی اور باہر کی طرف بڑھے۔ میں چھلانگ لگا کر بستر سے نکلا اور خاموشی سے اُن کے ساتھ ہو لیا۔ مکان کے باہر تازہ گوبر سے بھری ہوئی ایک ٹوکری رکھی تھی، جسے شاید سارنگ بابا نے پہلے سے منگوا لیا تھا۔ وہ اِس ٹوکری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔ ”اٹھا لو یہ

ٹوکری، بیٹے!"

میں نے وہ ٹوکری اُٹھا کر سر پر رکھ لی اور اُن کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

سارنگ بابا خاموشی سے چلتے ہوئے قریبی جنگل میں داخل ہوئے اور برگد کے ایک گھنے درخت کے نیچے جا کر رُکے۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ درخت بلکہ سارا جنگل پہلے سے اُن کا دیکھا بھالا ہے۔

برگد کی جڑوں کے درمیان ایک گڑھا پہلے سے موجود تھا، جو تازہ کھُدا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ شاید جس وقت میں اپنے بستر میں آرام کر رہا تھا۔ اُس وقت سارنگ بابا یہاں آ کر یہ گڑھا کھود گئے تھے۔ سارنگ بابا کی ہدایت کے مطابق میں نے گوبر کی آدھی ٹوکری گڑھے میں ڈال دی اور اُسے اچھی طرح پھیلا دیا۔ اِس کے بعد سارنگ بابا نے سانپ والی ہنڈیا گوبر کے درمیان رکھی اور اُن کے کہنے پر میں نے اس ہنڈیا کو باقی گوبر سے خوب اچھی طرح ڈھانپ دیا۔ پھر برگد کے نیچے گِرے ہوئے سوکھے پتّے جمع کر کے اُس گوبر پر ڈال دیے۔ اِس کے بعد اُن پتّوں پر مٹّی

ڈال کر گڑھا اِس طرح برابر کر دیا کہ کسی شخص کو یہ گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہاں کوئی چیز دبائی گئی ہے۔

جب میں یہ سارا کام کر چُکا تو سارنگ بابا کہنے لگے "لو، انوشا بیٹے۔ اس کام کا ایک مرحلہ تو طے ہوا۔ اب باقی معاملہ قُدرت کے ہاتھ ہے، اور قدرت ہر کام کے لیے وقت لیتی ہے۔ اِس ہنڈیا کو کم سے کم چھ مہینے اس حالت میں پڑا رہنا چاہیئے۔ اس سے زیادہ جتنی مدّت بھی لگے گی، اُتنی ہی اِس کی تاثیر اور بڑھے گی۔ اس لیے ہم اِسے قدرت کے بھروسے پر یہیں چھوڑ کر آگے چلے جائیں گے اور جب واپسی میں یہاں سے گزریں گئے تو اِسے نکال لیں گے۔ تم اِس جگہ اور اِس درخت کو اچھی طرح پہچان لو۔ ہو سکتا ہے تمہیں اکیلے ہی یہاں آنا پڑے۔ یہ تمہارا خزانہ ہے اور تکشک مہاراج سے اُمّید ہے کہ وہ اِسے تمہارے لیے محفوظ رکھیں گے۔ آؤ، اب چلیں۔ ہمیں اپنے دوست کی گھر والی کو بھی دیکھنا ہے۔"

میں نے اِرد گِرد نظر ڈالی اور برگد کے درخت کو غور سے دیکھ کر اُس کی تمام نشانیاں اپنے ذہن میں محفوظ کر لیں۔ پھر خالی ٹوکری اُٹھائی اور سارنگ بابا کے

ساتھ ہو لیا۔

جنگل سے باہر آ کر ہم سیدھے حویلی کی طرف گئے اور حویلی میں جا کر مریضہ کو دیکھا۔ وہ اب ہوش میں تھی اور اس کی حالت صُبح کی نسبت کافی بہتر تھی۔ سارنگ بابا نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر سردار سے کہنے لگے۔

"لو، میرے دوست، ہمارا فرض پورا ہو چکا ہے۔ کل صُبح ہم یہاں سے چل دیں گے۔"

سردار ایک دم سارنگ بابا کے پاؤں پر گر گیا اور کہنے لگا۔

"نہیں، بابا جی۔ اِس وقت تک ضرور یہاں رہنے کی تکلیف کیجیے جب تک میری گھر والی پوری طرح ٹھیک نہیں ہو جاتی۔ آپ کے کہنے کے مطابق دِنوں کی بات ہی تو ہے۔ وہ ٹھیک ہو جائے تو میں ایک جشن کروں گا۔ دس دس کوس کی تمام بستیوں کے لوگوں کی دعوت کروں گا۔ اِس جشن کے لیے کھیل تماشے کرنے والوں کو بھی بلاؤں گا۔ آپ اُس وقت تک ٹھہرنے کی تکلیف ضرور کریں۔ آپ

کے بغیر اِس جشن کی رونق پھیکی رہے گی۔ آپ کے بغیر اُس کا رنگ نہیں جمے گا۔"

سارنگ بابا نے کُچھ سوچا، پھر کہنے لگے:

"بہت اچھا میرے دوست۔ ہم تمہارا دِل توڑنا نہیں چاہتے۔ ہم تمہاری بیوی کے ٹھیک ہونے تک یہیں ٹھہرے رہیں گے اور تمہارے جشن میں بھی شامل ہوں گے۔ تم شوق سے کھیل تماشے کرنے والوں کو بلاؤ۔ ہو سکا تو ہم بھی اِس جشن میں کوئی تماشا دِکھانے کی کوشش کریں گے۔"

"آپ کی بڑی مہربانی مہاراج۔" سردار نے کہا۔ "یہ میری سب سے بڑی خوش قسمتی ہو گی۔"

پتھّر توڑ ناگ

سردار کی بیوی کو پورے طور پر تندرست ہونے میں بارہ دن لگے۔ یہ بارہ دن ہمارے لیے بے کار کی قید جیسے تھے۔ ہمیں روٹیاں توڑنے اور جنگل میں پھرنے کے سوا کُچھ کام نہ تھا۔ سارنگ بابا نے ان دنوں سے فائدہ اِس طرح اُٹھایا کہ اِرد گِرد کے جنگلوں میں پھِر کر بہت سی جڑی بوٹیاں اکٹھی کر لیں اور پھر انہیں کوٹ پیس کر مختلف دوائیں تیّار کرتے رہے۔ میں سارنگ بابا کی سکھائی ہوئی دُھنوں پر بِین بجانے کی مشق کرتا رہا۔

تیرہویں دِن سردار کی بیوی نے غسلِ صحت کیا اور اسی روز سے سردار نے

دعوت اور جشن کا آغاز کر دیا۔ تین دن تک اِرد گرد کی دس دس کوس تک کی تمام بستیوں کے لوگ آتے رہے اور سردار کے ہاں کھانا کھاتے رہے۔ اس کے ساتھ ہی کھیل تماشادِکھانے والی ٹولیاں بھی آنے لگیں۔

بستی کے باہر ایک وسیع میدان میں کھیل تماشے دِکھانے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ ایک اُونچے سے تخت پر سردار کے بیٹھنے کی جگہ بنائی گئی تھی۔ اس کے قریب بائیں طرف سارنگ بابا اور میرے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ سردار کے دائیں طرف سردار کی بیوی اور بستی کے بڑے گھرانوں کی عورتوں کے بیٹھنے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ اس سے آگے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کھیل تماشے دِکھانے والوں کی مختلف ٹولیاں اور پھر کُچھ فاصلہ چھوڑ کر عام لوگ نصف دائرے کی شکل میں کھڑے ہوئے تھے۔

سب سے پہلے جانوروں کے کرتب دِکھانے والی ٹولیاں آئیں اور اُنہوں نے کُچھ بندر اور دوسرے جانوروں کے تماشے دکھائے۔ اس کے بعد بازی گروں اور نٹوں کی ٹولیاں آئیں اور اُنہوں نے تنے ہوئے رسّے پر چلنے، قلابازیاں کھانے

اور اسی طرح کے دوسرے کھیل تماشے دکھائے۔ پھر تیر اندازوں کی ایک ٹولی آئی اور اس نے تیر اندازی کے کمال دِکھائے، ان میں سے ایک شخص نے آنکھوں پر پٹّی باندھ کر نشانے پہ تیر چلائے۔ ایک اور شخص نے اُلٹا لٹک کر تیر اندازی کا کمال دِکھایا۔ ایک اور تیر انداز نے اپنی کمان میں تیر چڑھا کر اُوپر کی طرف چلایا، پھر دوسرا تیر اِس طرح چلایا کہ اُس کی نوک پہلے تیر کے نِچلے سِرے میں جا لگی۔ اس کے بعد اس نے تیر یُوں چلایا کہ اُس کی نوک دوسرے تیر کے نِچلے سِرے میں پیوست ہو گئی۔ اس طرح اس نے ایک ایک کر کے سات تیر چلائے اور یہ سات کے سات تیر ایک دوسرے میں پیوست ہو کر اکٹھے، زنجیر کی صورت میں زمین پر آ گرے۔

اِس طرح کے اور بہت سے دِل چسپ کھیل تماشوں کے بعد سردار اپنی نشست سے اُٹھا اور کہنے لگا۔

”میرے بھائیو! جیسا کہ تم سب کو معلوم ہے، یہ جشن میری بیوی کے صحت یاب ہونے کی خوشی میں منایا جا رہا ہے۔ میری بیوی کی بیماری دور کرنے کا کارنامہ

سارنگ بابا اور اس کے چیلے انوشا نے انجام دیا ہے۔ اُنہوں نے اُس سانپ کو میری بیوی کے جسم سے نکالا تھا جو جونک کی طرح اُس کے کلیجے سے چمٹا ہوا اُس کا خون چوس رہا تھا۔"

یہ کہتے ہوئے سردار نے ہم دونوں کی طرف مُسکراتے ہوئے دیکھا اور پھر کہنے لگا۔ رہا تھا۔

"مہاراج! اس جشن کے لیے آپ نے بھی کوئی تماشا دِکھانے کا وعدہ کیا تھا۔ سب لوگ اپنا اپنا کرتب دِکھا کر لوگوں کو خوش کر چکے ہیں۔ اب مُجھے ہی نہیں، اِن سب لوگوں کو آپ کا انتظار ہے۔" یہ سُن کر سارنگ بابا نے میرا ہاتھ تھاما اور ہم دونوں اپنی جگہ سے اُٹھ کر تخت کے سامنے کھُلی جگہ میں آ کھڑے ہوئے۔ سارنگ بابا مُجھے اشارہ کرنے ہی والے تھے کہ لوگوں کے درمیان سے ایک آواز گونجی!

"ٹھہرو!"

اور اس کے ساتھ ہی ایک شخص لوگوں کے مجمعے میں سے چھلانگ لگا کر ہمارے سامنے آ کھڑا ہوا۔ میں نے ایک نظر اُس کی طرف دیکھا۔ اُونچا لمبا قد، بھاری بھر کم جسم اور توے کی طرح سیاہ رنگ۔ آدمی کیا تھا، اچھّا خاصا کالا دیو تھا۔

"کیا بات ہے؟" سارنگ بابا نے اُس سے پوچھا۔ "کون ہو تم، اور کیا چاہتے ہو؟"

"میں وہ سانپ دیکھنا چاہتا ہوں جو تُم نے سردار کی بیوی کے جسم سے نکالا تھا۔" وہ شخص بولا۔

سارنگ بابا مُسکراتے ہوئے بولے۔ "تم بہت دیر سے آئے ہو میرے دوست۔ اس بات کو تو پندرہ دِن ہو چکے ہیں۔"

"میں جانتا ہوں، لیکن وہ سانپ کہاں ہے؟"

"وہ اب یہاں نہیں ہے۔ نہ ہمارے پاس اور نہ بستی میں۔" سارنگ بابا نے کہا۔

اس پر وہ شخص سردار سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ "سردار! مُجھے یہ شخص کوئی

دھوکے باز معلوم ہوتا ہے، جس نے لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے جوگی اور سنیاسی کا روپ دھار رکھا ہے۔ میں نے سینکڑوں قسم کے سانپ دیکھے ہیں، لیکن یہ بات میں نے آج تک کہیں سُنی نہ دیکھی کہ کوئی سانپ کسی آدمی کے جسم میں داخل ہو گیا ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سانپ اِس کے پاس پہلے سے موجود تھا اور اس نے ہاتھ کی صفائی دِکھاتے ہوئے اُسے آپ کی بیوی کے جسم سے نکال کر دِکھا دیا۔ آپ کی اجازت سے میں اس مداری سے ذرا دو دو ہاتھ کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا بکتے ہو؟" سردار نے غصّے سے کہا۔ "ہم تمہیں۔۔۔"

"ٹھہرو، میرے دوست۔" سارنگ بابا نے سردار سے کہا۔ "اِس کی باتوں کا بُرا نہ مانو۔ جو کُچھ بھی ہوا ہے، وہ ایسا ہے کہ سُننے والے کو یقین آ ہی نہیں سکتا۔"

پھر سارنگ بابا اس شخص سے مخاطب ہوئے:

"دیکھو میرے دوست! تُم شاید مداریوں کی بانسریاں بند کرنے والے کھلاڑی ہو۔

لیکن ہم مداری نہیں ہیں۔"

"میں مداریوں کی بانسریاں بند کرنے والا کھلاڑی نہیں ہوں۔" اُس شخص نے غصّے سے کہا۔ "لیکن تم جیسے فریبی جوگیوں کے فریب کا پردہ چاک کرنا ضرور جانتا ہوں۔ میری ایک عُمر سانپوں سے کھیلتے گزری ہے۔ میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔"

"اب تم کیا چاہتے ہو؟" سارنگ بابا نے پوچھا۔

"تمہارے ساتھ مقابلہ۔" اُس شخص نے جواب دیا۔ "ایک وار تُم کرو، ایک وار میں کرتا ہوں، میں اپنا بچاؤ کروں گا، تُم اپنا بچاؤ کرنا۔"

سارنگ بابا سنجیدگی سے بولے!

"دیکھو! اس طرح کے مُقابلے کرنا ہماری شان کے خلاف ہے۔۔۔۔"

"یوں کیوں نہیں کہتے کہ تمہیں میدان میں آتے ڈر لگتا ہے۔" اُس شخص نے

کہا۔

"میرے اندر ڈر نام کی کوئی چیز نہیں ہے میرے دوست۔" سارنگ بابا بولے۔

"تو پھر چھوڑو فضول باتیں اور آؤ مُقابلے پر۔" اُس شخص نے کہا۔ "پہلے تُم وار کرو گے یا میں کروں؟"

"تُم پہلے وار کر سکتے ہو۔" سارنگ بابا بولے۔ "لیکن یاد رکھنا، اپنے انجام کے تُم خود ذمّے دار ہو گئے۔"

"میرے انجام سے پہلے تمہیں اپنے انجام کی فکر کرنی چاہیے۔" وہ شخص بولا۔ "میرے پاس وہ سانپ ہے جو پتھّر پر ڈنگ مارے تو پتھّر ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ لاؤ اپنا ہاتھ آگے کرو۔"

سارنگ بابا نے بڑے اطمینان سے اپنا بایاں ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اس شخص نے اپنے تھیلے میں سے ایک چھوٹی سی پٹاری نکالی، اُسے کھولا اور اُس کے اندر سے ایک سانپ نکال کر ہاتھ میں تھام لیا۔ پھِر اُس نے پٹاری زمین پر رکھ دی اور

گردن پکڑتے ہوئے اُسے سارنگ بابا کے ہاتھ کی طرف لایا۔ جیسے ہی سانپ کا مُنہ سارنگ بابا کے ہاتھ کے قریب آیا، اُس کی زبان تیزی سے حرکت میں آئی اور اُس نے سارنگ بابا کے ہاتھ پر ڈس لیا۔

مجمعے میں کھڑے بہت سے لوگوں کی چیخیں نکل گئیں لیکن سارنگ بابا اطمینان سے کھڑے رہے، جیسے کُچھ ہوا ہی نہیں۔ میں بھی اطمینان سے کھڑا تھا، لیکن حیران ضرور تھا کہ نہ جانے اب کیا ہو گا۔

سارنگ بابا چند لمحے خاموش کھڑے رہے۔ پھر اُنہوں نے یُوں ایک طرف تھوکا، جیسے سانپ کا زہر اُن کے ہاتھ سے ہوتا ہوا ان کے مُنہ میں آ پہنچا ہو اور اُسے اُنہوں نے تھوک کر باہر پھینک دیا ہو۔ پھر وہ اس شخص سے کہنے لگے۔

"لو دوست! تم اپنا وار کر چُکے، لیکن میرے پاس کوئی سانپ نہیں ہے جس سے تم پر وار کر سکوں۔ لاؤ یہی سانپ مُجھے دے دو۔ میں وار نہیں کروں گا۔ صرف تماشا دِکھاؤں گا۔"

یہ سُن کر وہ شخص ہچکچاتا ہوا پیچھے ہٹا۔ لیکن سارنگ بابا نے جھپٹ کر سانپ اُس کے ہاتھ سے چھین لیا اور پھر مُجھ سے بولے۔

"انوشا، آخری دُھن بجاؤ۔۔۔ سوویں دُھن۔"

اُن کے حکم کی دیر تھی کہ میں نے بِین بجانی شروع کر دی۔ وہی آخری سوویں دُھن جو سارنگ بابا نے مُجھے سکھائی تھی۔ اس شخص کے انداز سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتا ہے لیکن بِین کی آواز سُنتے ہی اُس کے قدم زمین میں گڑ گئے اور سانپ نے یوں پھَن اُٹھا کر میری طرف دیکھا جیسے بِین کی آواز سُنتے ہی چونک گیا ہو۔ میں کُچھ دیر تک بِین بجاتا رہا۔ وہ شخص اپنی جگہ سے حرکت کھڑا تھا اور سانپ سارنگ بابا کے ہاتھ میں بے چین ہوا جا رہا تھا۔ سارنگ بابا مُجھ پر، اُس شخص پر اور سانپ پر تینوں پر نگاہ جمائے ہوئے تھے۔ اچانک اُنہوں نے کہا:

"شاباش بیٹے! اب تم اِس شخص کی اوٹ میں ہو جاؤ اور بِین بجاتے رہو۔"

میں بین بجاتا ہوا اُس شخص کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ سارنگ بابا اُس کے سامنے کھڑے رہے۔ سانپ اُن کے ہاتھ میں بے چین ہو رہا تھا، جیسے وہ آزاد ہونا چاہتا ہو۔ لیکن سارنگ بابا نے اس کی گردن کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔

پھر اچانک سارنگ بابا نے سانپ کی گردن چھوڑ دی اور اُسے ذرا نیچے سے تھام لیا۔ اس کے ساتھ ہی سانپ نے ایک زور کی پھُنکار ماری۔ آگ کا شعلہ اُس شخص کی طرف لپکتا ہوا محسوس ہوا اور دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اُس شخص کا سارا جسم، سر سے پاؤں تک، خشک لکڑی کی طرح جلنے لگا ہے۔

اُس شخص نے ایک دم اپنے اِرد گِرد دیکھا اور پھر اس چھوٹے سے تالاب کی طرف بھاگا جو میدان کے سِرے پر واقع تھا اور اُس میں چھلانگ لگا دی۔ اس شخص کے تالاب میں چھلانگ لگاتے ہی سارا تالاب دہکتے ہوئے الاؤ کی شکل اختیار کر گیا جیسے وہ پانی کا تالاب نہ ہو، خشک گھاس پھونس کا ڈھیر ہو۔ لوگ اُس طرف جانا چاہتے تھے، لیکن سارنگ بابا نے اُنہیں ہاتھ کے اشارے سے روک دیا اور بولے!

"وہاں مت جاؤ۔ یہیں ٹھہرے تماشا دیکھتے رہو۔"

سردار، اُس کی بیوی اور دوسرے سب لوگ حیرانی سے پانی میں آگ کا یہ تماشا دیکھتے رہے۔ سارنگ بابا نے سانپ کو دوبارہ اُسی پٹاری میں بند کر دیا تھا، جس میں سے اس شخص نے اُسے نکالا تھا۔ میں بھی بین ہونٹوں سے ہٹا کر دوسرے لوگوں کی طرح پانی میں آگ کا انوکھا تماشا دیکھ رہا تھا۔

اور کُچھ دیر بعد جب آگ بُجھی تو سب لوگ تالاب کی طرف بھاگے۔ ان لوگوں میں سردار بھی تھا۔ سارنگ بابا نے سردار سے کہا"

"ٹھہرو! ہم بھی تمھارے ساتھ چلتے ہیں۔ اور پھر سارنگ بابا سردار کے ساتھ اس جگہ پہنچ گئے جہاں کبھی تالاب تھا۔ اب یہ جگہ یوں خشک تھی جیسے وہاں کبھی پانی کا قطرہ تک نہ تھا۔ پانی تو پانی وہاں کیچڑ نام کی بھی کوئی چیز موجود نہ تھا، بلکہ تالاب کی تہہ کی جگہ پتھّر کی سِل کی طرح سخت ہو چکی تھی اور سب سے عجیب بات یہ تھی کہ وہاں اس شخص کا کوئی نام نشان نہ تھا جس نے اپنے جلتے ہوئے جسم کے

ساتھ پانی میں چھلانگ لگائی تھی۔ نہ اس کی لاش تھی، نہ ہڈّیاں، نہ ہڈّیوں کی راکھ۔۔۔کُچھ بھی نہ تھا!

سب لوگ حیرت سے یُوں دیکھ رہے تھے جیسے اُنہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آرہا ہو۔ خاصی دیر کے بعد سردار کی زبان کھلی!

"یہ سب کیا ہوا، مہاراج؟"

"ایک تماشا، جو آپ دیکھنا چاہتے تھے، میرے دوست۔" سارنگ بابا بولے۔

"لیکن وہ شخص۔۔۔۔۔"

"اس کو بھول جاؤ میرے دوست۔" بابا نے کہا۔ "چوہا ہلدی کی ایک گانٹھ کو پا کر خود کو پنساری سمجھنے لگے تو اُس کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس کو یہ نایاب سانپ کہیں سے ہاتھ آگیا تھا اور اب وہ یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ میں سانپوں کا بادشاہ ہوں اور دُنیا کا کوئی جوگی، کوئی سنیاسی، کوئی سپیرا میرے آگے نہیں ٹھہر سکتا۔ وہ غرور میں آکر اپنے آپ کو بھُلا بیٹھا۔ اِس سانپ کا زہر واقعی ایسا ہے کہ پتھّر کو ریزہ

ریزہ کر دے۔ لیکن وہ خود اُس کی پھُنکار بھی برداشت نہ کر سکا اور اُس کا جسم جل کہ راکھ ہو گیا۔ اُس نے تو اپنے آپ کو بچانے کے لیے پانی میں چھلانگ لگائی تھی، لیکن اُس کے جسم کو جو آگ لگی تھی، وہ کوئی معمولی آگ نہ تھی۔ اُس آگ نے اُس کے جسم کے ساتھ، اِس تالاب کے پانی کو بھی خُشک کر دیا۔ تالاب کا پانی تو بھاپ بن کر اُڑ گیا ہے لیکن اِس شخص کا جسم راکھ ہو کر تالاب کی تہہ کی کیچڑ میں مل گیا، اور یہ اُسی کی گرمی کا اثر ہے کہ تہہ خشک ہو کر پتھّر کی سِل کی طرح سخت ہو چکی ہے۔ ایسے لوگ جو بے وقوف ہونے کے ساتھ ساتھ مغرور بھی ہوں، ایسے ہی انجام کو پہنچتے ہیں۔"

سردار نے جواب میں کُچھ نہ کہا۔ وہ اب تک دوسرے لوگوں کی طرح حیرانی سے اُس گڑھے کو دیکھ رہا تھا جو کبھی تالاب ہوا کرتا تھا۔

سارنگ بابا کہنے لگے۔

"ہم تو کُچھ اور تماشا دِکھانے کا ارادہ رکھتے تھے، لیکن قدرت نے تمہارے لیے

ایک ایسے تماشے کا بندوبست کر دیا جو ہزار تماشوں کا ایک تماشا ہے، اور اُس کے انعام کے طور پر ہمیں ایک ایسا سانپ ہاتھ آیا ہے جو ہزار سانپوں کا ایک سانپ ہے۔"

سردار اب بھی خاموش رہا۔ سارنگ بابا کہنے لگے:

"اب ہم اپنا وعدہ پورا کر چکے ہیں اور اب تُم سے اجازت چاہیں گے۔ لیکن اِس سے پہلے کہ ہم جائیں، تُم اپنے آدمیوں سے یہاں مٹّی ڈلوا دو اور پھر اِس کے گرد باڑ لگوا دو۔ یہ جگہ گرم ہے اور ایک مدّت تک گرم رہے گی۔ لوگوں کے لیے یہی بہتر ہو گا کہ وہ اِس سے دور رہیں۔"

سارنگ بابا کی ہدایت کے مطابق سردار نے لوگوں کو حکم دیا۔ لوگ فوراً بستی کی طرف گئے اور وہاں سے کُدالیں اور ٹوکریاں لے آئے۔ پھر وہ مٹّی لا کر وہاں ڈالنے لگے۔ جلد ہی وہ گڑھا پُر ہو گیا۔ اس پر اور مٹّی ڈال کر وہاں ایک چھوٹا سا ٹیلا بنا دیا گیا اور اُس کے گرد کانٹے دار جھاڑیوں کی باڑ لگا دی گئی۔ اِس کے بعد سب

لوگ بستی کی طرف واپس ہوئے۔

رات ہم نے اُس بستی میں ہی گزاری اور پھر اگلی صُبح مُنہ اندھیرے ہی آگے روانہ ہو گئے۔

غار کے قیدی

پہلے ہم صرف دو مسافر تھے۔ اب ہمارے ساتھ وہ سانپ بھی شامل ہو گیا جو اُس جشن میں ہمارے ہاتھ آیا تھا۔ سارنگ بابا نے بستی سے باہر آتے ہی جو پہلی بات مُجھ سے کہی تھی، وہ اُس سانپ سے متعلّق تھی۔ اُنہوں نے کہا تھا:

"انوشا بیٹے! اب ہم دو سے تین ہو گئے ہیں۔ جس طرح تُم میرے بیٹے ہو اِسی طرح یہ سانپ بھی میرا بیٹا ہے۔ تُم دونوں بھائی ہو۔ تمہیں اِس کا خیال رکھنا ہو گا، اور دیکھنا یہ بھی تمہارا خیال رکھے گا۔"

اب میرا یہ کام تھا کہ جب کسی بستی سے ہمارا گزر ہو تو اُس بستی سے اپنے بھائی کے

لیے دُودھ مہیّا کروں۔ میں نے اب تک جو زندگی گزاری تھی، اُس میں کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کا کبھی سوال ہی پیدا نہیں ہوا تھا۔ راجا امبھی کے بیٹے انوشا نے راج محل سے آجانے کے بعد بھی بڑے ٹھاٹ سے دِن بسر کیے تھے۔ لوگ بِن کہے اس کی ضرورتیں پوری کرتے تھے، لیکن اب وہی انوشا سارنگ بابا کے حُکم پر مجبور تھا کہ مانگ تانگ کر اپنے سانپ بھائی کے لیے دُودھ کا بندوبست کرے۔ اُسے اپنا پیٹ بھرنے کے لیے کُچھ ملے یا نہ ملے، اپنے بھائی کے لیے دُودھ حاصل کرنا ہر حال میں لازمی تھا۔

شروع شروع میں مُجھے خاصی پریشانی اُٹھانی پڑی۔ کبھی کسی سے سوال جو نہیں کیا تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ میں اُس کا عادی ہو گیا۔ لیکن اصل میں مُجھے جس چیز نے اِس کا عادی بنایا وہ یہ تھی کہ میرا سانپ بھائی پہلے روز سے ہی مُجھ سے مانوس ہو گیا۔ وہ میرا جھُوٹا دُودھ پیتا تھا اور کبھی کبھی میں بھی اُس کا جھوٹا پی لیتا تھا۔ اُسے پٹاری میں بند کرنے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ دِن بھر وہ میرے گلے میں ہار کی طرح جھولتا رہتا تھا اور رات کو یوں مُجھ سے لپٹ کر سوتا تھا جیسے دو بھائی ایک ہی

بستر پر سوتے ہیں۔

یہ سب کُچھ سارنگ بابا کی خواہش کے مطابق ہو رہا تھا۔ مُجھے اِس بات پر حیرانی ضرور تھی، اِس لیے کہ اِس سانپ کو سارنگ بابا نے نہیں، کسی اور نے پالا تھا اور جشن کے منانے میں اتّفاقی طور پر وہ سارنگ بابا کے ہاتھ آیا تھا لیکن یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ جنم جنم سے سارنگ بابا کے اشاروں کا غلام ہے۔

سارنگ بابا نے اُس کا نام شانی رکھ دیا تھا اور اُن کے پُکارنے پر وہ ایک اچھے اور فرماں بردار بچّے کی طرح اُن کی طرف لپکتا تھا۔

پھر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے میرے دِل کو ہمیشہ کے لیے شانی کا غلام بنا دیا۔

ہم ویری ناگ کے چشمے کی طرف جا رہے تھے، جہاں سارنگ بابا کے حکم کے مطابق مُجھے اُن کی شاگردی کے کئی نئے اور خاصے مُشکل مرحلوں سے گزرنا تھا۔ ابھی کئی روز کا سفر باقی تھا کہ ہم ایک پہاڑی بستی کے پاس سے گزرے۔ شانی کئی

دِنوں کا بھوکا تھا، اِس لیے بستی میں داخل ہوتے ہی میں نے اُس کے لیے دُودھ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اُسے اتّفاق کہیے یا بد قسمتی کہ مُجھے اِس بستی کے کسی ایک گھر سے بھی دُودھ نہ مل سکا۔ چرواہے جانوروں کو لے کر وادی میں گئے ہوئے تھے اور اُن کی شام کے وقت واپسی پر ہی دُودھ مل سکتا تھا اور شام ابھی دور تھی۔

لیکن شام سے پہلے ہی آندھی اور پھر بارش آ گئی اور بستی کے چرواہے اپنے جانوروں سمیت وادی میں گھِر کر رہ گئے۔ شانی بھُوک سے بے حال ہو رہا تھا۔ اُس کی بے چینی سارنگ بابا سے نہ دیکھی گئی۔ وہ مُجھے اور شانی کو بستی کے قریب ایک پہاڑی غار میں ٹھہرا کر اُس وادی کی طرف چل دیے جہاں چرواہے آندھی اور بارش میں گھِرے ہوئے تھے۔

ایسے خراب موسم میں سارنگ بابا کا وادی کی طرف جانا اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے سے کم نہ تھا۔ لیکن اُنہیں روکنے کی ہمّت مُجھ میں تھی ہی کہاں۔ وہ چلے گئے اور میں دِل میں یہ دُعا کرتا رہ گیا کہ وہ خیریت کے ساتھ، جلد واپس آ جائیں۔

طوفان کم ہونے کے کوئی آثار نہ تھے۔ اِس آندھی اور بارش کے طوفان میں میرے کان برابر سارنگ بابا کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔

میں اِس انتظار ہی میں تھا کہ بڑے زور کا دھماکا ہوا۔ یُوں لگا جیسے آسمان ٹوٹ پڑا ہے یا پھر زمین پھٹ گئی ہے۔ دھماکا ایسا سخت تھا کہ میرا دِل دہل گیا اور گلے میں جھولتا ہوا شانی بھی چونک گیا۔ دوسرے ہی لمحے مجھے احساس ہوا کہ غار کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔ شاہد یہ دھماکہ بجلی کے گِرنے کا تھا، جو شاید غار کے باہر پہاڑی پر گری تھی۔ اِس دھماکے سے ایک بھاری چٹّان لڑھکتی ہوئی نیچے آ گری اور اس کی وجہ سے غار کا دروازہ بند ہو گیا تھا۔ میں اور شانی دونوں غار کے اندر بند ہو گئے تھے۔

میں فوراً غار کے دروازے کی طرف لپکا، لیکن چٹان کو ہاتھ لگاتے ہی احساس ہو گیا کہ اُسے اپنی جگہ سے سِرکانا میرے جیسے کم عُمر لڑکے کے بس کی بات نہیں۔ ہو سکتا ہے سارنگ بابا اکیلے یا کُچھ اور لوگوں کی مدد سے اُسے ہٹا سکیں۔ لیکن خُدا معلوم کہ وہ اِس آندھی اور بارش کے عالم میں کتنی دیر میں واپس آئیں گے، اور

نہ جانے آئیں گے بھی یا نہیں!

یہ خیال کر کے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ لیکن میں نے انہیں جلدی سے پونچھ ڈالا اور حوصلہ کر کے دروازے پر پڑی ہوئی چٹان کو دھکیلنے کی کوشش کی۔ لیکن چٹان میری سر توڑ کوششوں کے باوجود اپنی جگہ سے ذرا بھی نہیں ہِلی۔ میں نے دو ایک بار پھر کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ آخر تھک ہار کر، روتی ہوئی آنکھوں اور بُجھے ہوئے دِل کے ساتھ، غار کے ایک کونے میں جا بیٹھا اور انتظار کرنے لگا کہ قدرت میری کب مدد کرتی ہے۔ کرتی بھی ہے یا نہیں!

اس تگ و دو میں مُجھے شانی کا بالکل دھیان ہی نہیں رہا تھا۔ اب جو مایوس سا ہو کر میں نے اپنے سینے پر ہاتھ پھیرا تو معلوم ہوا کہ شانی وہاں نہیں ہے۔ میرا دل کانپ سا نپ سا گیا اور میں نے اُسے اپنے گلے کی پوری طاقت سے پکارا: ”شانی!“

اُس کے جواب میں پھُنکار کی آواز آئی۔ یہ پھُنکار شانی کی تھی اور غار کے بند دروازے کے پاس آئی تھی۔ میں دروازے کی طرف بڑھنے ہی لگا تھا کہ کسی نے

میرے کان میں آہستہ سے کہا۔

"انوشا بھائی! جہاں ہو وہیں گھِرے رہو۔"

میں حیران رہ گیا۔ کیا شانی نے میرے کان میں سرگوشی کی تھی؟ ایک سانپ نے؟ اور پھر بالکل انسان کی طرح! بھائی تو میں صرف شانی ہی کا تھا۔ میرا ذہن اُلجھ سا گیا۔ یہ کیا گورکھ دھندا ہے؟

لیکن عین اُسی وقت ایک اور پھُنکار کی آواز غار میں گُونجی۔ یہ آواز پہلے سے زیادہ بُلند تھی اور اُس کے ساتھ ہی غار کے بند دروازے پر پڑی ہوئی چٹان سُرخ ہو گئی۔ اس کے بعد ایک اور پھُنکار کی آواز آئی اور چٹان اور زیادہ سُرخ ہو گئی، اتنی سُرخ کہ دہکتا ہوا انگارا معلوم ہونے لگی۔ پھر ایک اور پھُنکار کی آواز آئی۔ اِس کے ساتھ ہی ایک دھماکا ہوا اور چٹان کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ غار کا بند دروازہ کھل گیا تھا۔

یہ حیرت انگیز کارنامہ شانی نے کیا تھا۔ میں دوڑ کر آگے بڑھا اور اُسے گود میں اٹھا

کر پیار کرنے لگا۔ وہ مُجھ سے یوں چمٹ گیا جیسے کبھی میں اپنی ماں سے چمٹ جایا کرتا تھا۔

شانی کو گود میں اُٹھا کر میں نے غار سے نظر دوڑائی۔ سارنگ بابا دُودھ کا برتن لیے غار کی طرف چلے آرہے تھے۔ طوفان تھم گیا تھا اور آسمان بھی صاف ہو گیا تھا۔ سارنگ بابا کو دیکھتے ہی میں تیزی سے ان کی طرف لپکا اور اُن کے سینے سے لگ کر رونے لگا۔ اُنہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے شانی کی طرف دیکھا، جو ادھ مُوا سا ہو چکا تھا۔ وہ وہیں بیٹھ گئے اور اُسے دُودھ پلانے لگے۔

شانی دُودھ پینے لگا اور میں نے سارنگ بابا کو آنسوؤں اور ہچکیوں کے درمیان شانی کے کارنامے سے آگاہ کیا۔ سارنگ بابا نے ساری کہانی سُن کر تعریفی نظروں سے شانی کی طرف دیکھا اور پھر بولے:

"انو شا بیٹے! آج شانی نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ سچ مُچ تمہیں اپنا بھائی سمجھتا ہے۔"

میں نے جواب میں کُچھ کہنے کے بجائے شانی کی طرف دیکھا جو اپنی لپکتی ہوئی

زبان سے جلدی جلدی دُودھ پی رہا تھا۔ لیکن اس کی آنکھیں میری طرف لگی ہوئی تھیں۔ جب وہ خوب سیر ہو گیا تو سارنگ بابا نے دُودھ کا برتن میری طرف بڑھا دیا۔ اس میں تھوڑا سا دودھ باقی تھا، جسے میں ایک ہی سانس میں پی گیا۔

اِس واقعے کی خبر جلد ہی بستی والوں کو ہو گئی اور وہ ٹولیوں کی صورت میں جمع ہو کر اس شانی کو دیکھنے کے لیے آنے لگے جس نے اپنی پھُنکار اور زہر سے ایک چٹان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔ اگرچہ بستی والے اس سانپ کو اس وقت پہلے ہی دیکھ چکے تھے۔ جب میں نے اُس کے لیے دُودھ مہیّا کرنے کی خاطر بستی کے ایک ایک گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا اور شانی میرے گلے میں جھُولتا رہا تھا، لیکن اِس وقت وہ اُن کی نظروں میں صرف ایک معمولی سانپ نہ تھا۔۔۔ اور اب وہ اُسے یُوں حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے وہ سانپ نہ ہو، کوئی بڑے ہی رُعب داب والا بادشاہ ہو۔ پھر بستی کا سردار آگے بڑھا، اُس نے سارنگ بابا کے پیروں کو ہاتھ لگایا اور کہنے لگا:

”مہاراج! ہم اپنی پچھلی کوتاہی کی معافی چاہتے ہیں۔ اصل میں بات یہ ہے کہ یہ

علاقہ سانپوں کا علاقہ ہے اور یہاں سے سینکڑوں جوگی، سپیرے اور سنیاسی گزرتے رہتے ہیں۔ ہم نے آپ کو بھی دوسرے جوگیوں اور سپیروں کی طرح سمجھا تھا۔ اس لیے آپ کے حال پر کوئی توجّہ نہیں دی۔ لیکن اب ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ جس کا سانپ اپنی پھُنکار سے چٹان کو ٹکڑے ٹکڑے کر سکتا ہے، وہ خود کیسا اُونچے درجے کا جوگی اور پہنچا ہوا سنیاسی ہو گا۔ ہم آپ سے ایک بار پھر اپنی غَلَطی کی معافی چاہتے ہیں اور درخواست کرتے ہیں کہ آپ چل کر ہماری بستی کو رونق بخشیں اور ہمیں خدمت کا موقع دیں۔"

سارنگ بابا کہنے لگے۔

"ہمیں تُم سے کوئی گِلہ نہیں ہے، بھائی۔ وہ جوگی اور سنیاسی ہی کیا ہے جو دُنیا کا گِلہ کرے یا لوگوں کی کسی کوتاہی یا زیادتی کی شکایت کرے۔ ہم تو سیلانی آدمی ہیں۔ آج یہاں، کل وہاں۔ ایک رات کی بات ہی تو ہے۔ یہیں گزار کر آگے چل دیں گے۔ تُم کاہے کو تکلیف کرتے ہو۔"

”نہ نہ مہاراج۔“ سردار نے سارنگ بابا کے گھٹنے تھام لیے۔ ”ہمیں اپنی خدمت کا موقع ضرور دیجیے۔ ہم آپ کی کوئی خدمت نہ کر سکے تو ہمارے دِل پر ایک بوجھ رہے گا۔ اس پر سارنگ بابا مان گئے۔ بولے:

”بہت اچھا بھائی، ہم چلے چلتے ہیں۔ لیکن صرف رات بھر کے لیے ٹھہریں گے اور صُبح ہوتے ہی چلے جائیں گے۔ ہماری منزل پہلے ہی بہت کھوٹی ہو چکی ہے۔“

یہ کہتے ہوئے سارنگ بابا نے مُجھے اشارہ کیا اور ہم سردار کے ساتھ ہو لیے۔ وہ رات ہم نے بستی میں گزاری اور صُبح ہوتے ہی آگے روانہ ہو گئے۔ اب ہماری منزل ویری ناگ کا چشمہ تھی۔

ویری ناگ کے چشمے پر انوشا کے ساتھ کیا ماجرا پیش آیا؟ اس نے سنہری ناگ کا مَن کیسے حاصل کیا؟ کیسر ناگ کے خوف ناک جنگل میں اُس کے ساتھ کیا کُچھ ہوا؟ کیسر ناگ کے جنگل سے راجا پورس کے دربار تک کیا کیا واقعات پیش آئے؟

یہ جاننے کے لیے انوشا کی آپ بیتی کا دوسرا حصّہ ”انوشا اور راجا پورس“ پڑھیے۔